سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

بیوقوف لوگ بول اٹھیں گے، کس چیز نے ان کو ان کے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے۔ کہہ مشرق اور مغرب اللہ کا ہی ہے، وہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (177)

177- قِبْلَةَ۔ مُقَابَلَةٌ سے لیا گیا ہے اور اصل میں اس خاص حالت کا نام ہے جس پر سامنے کھڑا ہونے والا ہو۔ (غ) چنانچہ دو آدمی جو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا قبلہ کہلائے گا۔ (ج) اور اس کے مقابل دِبْرَةٌ ہے جو پیٹھ کی طرف کی چیز کو کہتے ہیں۔ اور عرف میں قبلہ اس مکان مقابل کا نام ہو گیا ہے جس کی طرف نماز میں منہ ہو۔

تحویل قبلہ:

یہاں سے وہ مضمون شروع ہوتا ہے جو تحویل قبلہ کے نام سے موسوم ہے یعنی بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا۔ اس کا تعلق پچھلے مضمون سے ظاہر ہے کیونکہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کا ہی ذکر ہے۔ گو الفاظ قرآنی کی ہم اور تاویل بھی کر سکیں۔

تحویل قبلہ پر احادیث:

مگر روایات صحیحہ میں تحویل قبلہ کا کھلا ذکر ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہی متعدد روایات طرق مختلفہ سے اس بارہ میں آئی ہیں۔ یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت عبداللہ بن دینار کی روایت سے کہ مسجد قباء میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے جب ایک شخص نے ان کو اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو چکا ہے اور لوگوں نے حالت نماز میں ہی شام سے مکہ کی طرف منہ پھیر لیا۔ یہ روایت کتاب التفسیر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے پانچ مختلف طریقوں سے بیان کی ہے اور براء رضی اللہ عنہ کی روایت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آ کر سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تب آپ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا۔ یہ بھی دو طریق پر آئی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کہ انہوں نے فرمایا کہ اب ان لوگوں میں سے جنہوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی میرے سوا کوئی زندہ نہیں رہا۔ اور پھر اس کی مؤید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة: 125:2] ''اور ابراہیم کے مقام کو قبلہ نماز بناؤ'' کے ماتحت امام بخاری رحمہ اللہ کتاب التفسیر میں لائے ہیں کہ آپ نے فرمایا تین باتوں میں میرے رائے کا توافق اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ [لَوِ اتَّخَذْتَ مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قَوْلُهُ (وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى): 4483) اگر آپ مقام ابراہیم یعنی کعبہ کو مصلی یعنی قبلہ بنائیں۔ پس اس قدر روایات کے ہوتے ہوئے اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد خانہ کعبہ صریح

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو

وحی الٰہی کے ماتحت قبلہ قرار پایا۔

تحویل قبلہ دو دفعہ نہیں ہوئی:

البتہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تحویل قبلہ دو دفعہ ہوئی وہ صریح غلطی پر ہیں۔ اس کے لیے کہ نہ قرآن میں کوئی دلیل ہے نہ کسی حدیث صحیح میں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں بھی آنحضرت ﷺ بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ البتہ وہاں خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کو سامنے رکھ لیتے تھے۔ مدینہ میں جب تشریف لائے تو یہ دقت پیش آئی کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے سے خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ ہوتی تھی۔ اس لیے آپ کا دل یہ چاہتا تھا جیسا کہ روایات میں صاف آیا ہے کہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ ہو۔ جس کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تھا۔ مگر چونکہ آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام جو گزرے ان کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لیے آپ نے بھی اسی کو قبلہ رکھا یہاں تک کہ وحی الٰہی سے تحویل قبلہ ہوئی۔

وحی الٰہی قلب نبوی سے نہ پھوٹتی تھی:

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کا سرچشمہ نبی ﷺ کا اپنا قلب نہ تھا۔ ورنہ سولہ سترہ ماہ تک آپ کا دل تو یہ چاہے کہ خانہ کعبہ قبلہ ہو مگر وحی نازل نہ ہو، یہ بے معنی بات ہے۔

مَا وَلّٰىهُمْ کے معنی:

اس تحویل قبلہ میں کیا راز تھا۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ رہا یہ کہ آیا الفاظ مَا وَلّٰىهُمْ میں اسی تحویل قبلہ کی طرف اشارہ ہے یہ علیحدہ سوال ہے۔ ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا؟ یہ تو صریح تحویل قبلہ کا ذکر ہو گیا۔ اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان انبیاء کے قبلہ سے (جن کا ذکر ابھی نا م لے کر ہوا ہے) جس پر وہ انبیاء علیہم السلام تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا؟ جس میں تحویل قبلہ ضروری نہیں ٹھہرتی۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے یعنی خانہ کعبہ، کس چیز نے بھگا دیا؟ اور یہ اشارہ ہوگا ہجرت کی طرف کہ جب ان کا قبلہ خانہ کعبہ تھا تو وہاں سے بھاگ کر کیوں آئے؟ ﴿لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ﴾ جو جواب دیا ہے آخری معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا وہاں سے چلا آنا قبلہ ہونے کے منافی نہیں۔ اس لیے کہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے وہ ان کو اس قبلہ کا مالک بھی بنا دے گا۔ پہلے دو معنی اختیار کرنے کی صورت میں لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ سے یہ مراد ہوگی کہ اللہ کا تعلق تو کسی خاص سمت سے نہیں۔ سب سمتیں اسی کی ہیں۔ اگر ایک زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا اور اب کعبہ ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں یہ ضروری تھا کہ آخری نبی ﷺ کا وہ قبلہ مقرر کیا جاتا جو دنیا میں خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر تھا اور اسی کی طرف الفاظ صراط مستقیم میں اشارہ ہے۔ یا یہ اشارہ ہے کہ یہ صحیح تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں

عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى

ہو۔[178] اور ہم نے اسے جس پر تو تھا قبلہ نہیں بنایا مگر اس لیے کہ ہم اس شخص کو جو رسول کی پیروی کرتا ہے اس سے الگ کر دیں جو اپنی ایڑیوں پر واپس ہوتا ہے اور بے شک یہ ایک بھاری بات تھی مگر (نہ) ان لوگوں پر

ہم نے مسلمانوں کو دی۔

178- وَسَطًا۔ وَسَطٌ کسی چیز کا درمیان ہے اور بعض اوقات بلحاظ اطراف کے جو افراط وتفریط کو ظاہر کرتی ہیں اعلیٰ اور اشرف چیز کو بھی وسط کہا جاتا ہے۔ (غ) چنانچہ بخاری میں اَلْوَسَطُ کے معنی اَلْعَدْلُ لکھے ہیں اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ محاورہ عرب میں خِيَارٌ یعنی بہترین لوگ وسط کہلاتے ہیں۔ اور یہاں مراد ایسا گروہ ہے جو افراط وتفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوا ہے۔

شُهَدَآءَ۔ شَهِيْدٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 37]۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شُهَدَاءٌ سے مراد ایسے لوگ ہیں جو جس بات کو سنتے ہیں اس کو اپنے دل میں حاضر رکھتے ہیں اور گواہ ہونے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو علم انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا ہے اسے لوگوں کو پہنچائیں۔ اس لحاظ سے شہداء کے معنی مزکی کے بھی ہو سکتے ہیں اور پیشرو یا امام بھی۔ اور یہاں یہی مراد ہے۔

قبلہ کے مضمون میں ختم نبوت کی طرف اشارہ:

كَذٰلِكَ میں اشارہ پچھلی آیت کے مضمون کی طرف ہے یعنی خانہ کعبہ کو جو توحید کا اصل مرکز ہے قبلہ مقرر کرنے میں ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ یہ نبی آخری نبی ہے اور اب اسی کے پیرو دنیا میں علم دین کو پھیلانے والے اور دنیا کے حقیقی پیشرو اور امام ہوں گے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ ان کے پیشرو اور امام ہیں۔ ﴿وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ کو پیچھے رکھ کر یہ صاف طور پر سمجھا دیا ہے کہ جس قدر نیکی کی تعلیم اور نفوس انسانی کے تزکیہ کرنے والے اب دنیا میں ہوں گے ان سب کے پیشوا اور سردار اور مزکی محمد رسول اللہ ﷺ ہوں گے اور یوں وہ سب ایک ہی سردار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے دنیا میں اتحاد قومی اور وحدت انسانی کی بنیاد رکھنے والے ہوں گے۔

کمالاتِ امت محمدیہ:

اس آیت میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کمالات کی طرف بلکہ کل امت محمدیہ کے کمالات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو کام دنیا میں انبیاء علیہم السلام کرتے تھے وہ اب محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا کریں گے۔ اور یا كَذٰلِكَ کہہ کر یہ اشارہ کیا کہ جس طرح یہ تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں تاہم ایک قبلہ یعنی سب کا ایک طرف منہ کرنا اتحاد کے لیے ضروری ہے ایک میانہ روی کی تعلیم ہے جو ہم نے تم مسلمانوں کو دی ہے۔ اسی طرح ہر امر میں ہم نے تم کو میانہ روی کی تعلیم دی ہے تا کہ تم ہمیشہ کے لیے دنیا کے پیشرو بنو۔

اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ جنہیں اللہ نے ہدایت کی(179) اور اللہ (ایسا) نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے،

179- **تحویل قبلہ کے ذریعہ تمحیص:** ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ﴾ ان الفاظ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ ''ہم نے اسے قبلہ نہیں بنایا تھا جس پر تم اب تک تھے۔'' مگر اس لیے کہ کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو۔ یعنی بیت المقدس جو کچھ دیر تک قبلہ رہا اور اس کے بعد اب خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا گیا، تو یہ تمحیص کے لیے تھا۔ اور یہاں جَعَلْنَا کا مفہوم ایسا ہی ہے جیسے ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ [بني إسرائيل: 60:17] ''اور ہم نے اس رؤیا کو جو تجھے دکھایا صرف لوگوں کے لیے فتنہ بنایا۔'' میں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا کہ رؤیا فتنہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ دیا تھا۔ نہ ایسی کوئی وحی قرآن میں موجود ہے نہ کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی کے حکم سے منہ کیا ہو۔ ہاں جب آپ کو مدینہ میں آ کر خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں سے ایک کو انتخاب کرنا پڑا تو آپ نے بیت المقدس کی طرف منہ کیا اور کعبہ کی طرف پیٹھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک آپ کو اسی حالت پر چھوڑ دیا اور وحی الٰہی نازل نہ کی اور اس کی غرض جیسا آگے آتا ہے تمحیص تھی۔ اور دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ كُنْتَ بمعنی صِرْتَ لیا جائے یعنی ہم نے اسے جس پر تو اب ہوا ہے قبلہ نہیں بنایا مگر اسی غرض کے لیے اور اس صورت میں مراد خانہ کعبہ ہوگا اور كُنْتَ عَلَيْهَا سے مراد مُعْتَقِدٌ لِاسْتِقْبَالِهَا بھی ہو سکتی ہے یعنی جس کی طرف تمہاری توجہ کا عقد تھا۔

علم بمعنی تمیز:

لِنَعْلَمَ کے معنی تاہم الگ الگ کر دیں کیے گئے ہیں۔ کیونکہ علم بمعنی تمیز بھی آتا ہے خصوصاً جب اس کا صلہ مِنْ ہو جو تمیز کے لیے آتا ہے۔ (ح) اور بعض نے علم بمعنی رُؤْيَةٌ لیا ہے۔ (ج) یعنی تاہم دیکھیں کہ کون ایسا ہے اور کون ایسا؟ اور رُؤْيَةٌ بمعنی اس لیے صحیح ہیں کہ یہ وہ علم الٰہی ہے جو ایک واقعہ کے ظہور کے بعد ہوتا ہے۔ اور یہ فی الحقیقت رُؤْيَةٌ کے قائم مقام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم انسانوں کے متعلق دو قسم کا ہے: ایک آئندہ کا علم جب ابھی تمام امور پردہ غیب میں ہیں۔ ایک وہ علم جو اظہار واقعہ کے بعد ہوتا ہے جس پر ایک فعل کے واقعہ ہو جانے کی وجہ سے جزا و سزا مترتب ہوتی ہے۔ اس حصہ آیت میں تحویل قبلہ کی غرض بتائی ہے کہ کھرے کھوٹے الگ الگ ہو جائیں۔

ایک سچے دین کو تمحیص کی ضرورت بھی پیش آتی ہے: تا گریز دہر کہ بیرونی بود۔ اگر کچے پکوں کے ساتھ ملے رہیں تو دین کی اصل غرض پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ تمحیص کے لیے بعض واقعات ایسے پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تمحیص کوئی چھوٹی سی نہ تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے تو بیت المقدس قبلہ رہا۔ حالانکہ وہاں مشرک ہی مشرک تھے جو خانہ کعبہ کی عزت کرتے تھے۔ مگر بیت المقدس کی عزت نہ کرتے تھے۔ اور جب مدینہ میں آئے جہاں یہودیوں کا زور تھا تو خانہ کعبہ قبلہ ہوا۔ تا کہ وہی لوگ مسلمان ہوں جن کے دلوں میں صداقت اسلامی مرکوز ہو چکی ہے اور کوئی ابتلا ان کے قدم کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ ایک اور غرض تحویل قبلہ میں یہ بھی تھی

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ اللہ لوگوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔(180)

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ ہم یقینا تیرے آسمان کی طرف توجہ کرنے کو دیکھتے ہیں
فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ پس ضرور ہم تجھے اس قبلہ کا متولی بنا دیں گے جسے تو پسند
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ کرتا ہے، سو تو اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور
فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف پھیر
اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ دو۔(181) اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے یقینا

کہ قبلہ کوئی پرستش کی چیز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو شروع سے ایک ہی قبلہ ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ توحید کے احکام تو ابتدا میں ہی دے دیئے گئے۔ پھر خانہ کعبہ کو قبلہ اس وقت بنایا جاتا ہے جب مشکلات کا زمانہ گزر گیا ہے۔ اگر ابتدا میں ہی خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا جاتا تو شاید عرب کے لوگ یہ سمجھ کر بھی ساتھ شامل ہو جاتے کہ کیا حرج ہے ہمارے آبائی دین کے ہی یہ ارکان ہیں۔ مگر نہ صرف اس کو ابتدا میں قبلہ قرار نہیں دیا گیا بلکہ مدینہ میں سولہ مہینے اس کی طرف پیٹھ بھی کروائی۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ پرستش کی چیز نہیں۔

180- ایمان کے معنی یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بخاری میں صلوٰۃ مروی ہیں۔ یعنی یہ منشا ہے کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں وہ ضائع نہیں ہوئیں۔ کیونکہ نماز تو خدا کی ہے اس کو قبلہ سے کوئی ایسا تعلق نہیں کہ اگر اس طرف منہ کر کے نہیں پڑھی گئی تو نماز ہی نہیں ہوئی۔

اس میں بھی اس غلط خیال کی تردید کی ہے کہ قبلہ مسلمانوں کی عبادت میں کوئی اصلی مقصود ہے: جیسا کہ مخالفین اسلام نے غلطی سے خیال کر لیا ہے۔ ایمان کا لفظ لانے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ قبلہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے ایمان میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہو۔

رَءُوْفٌ کے معنی میں اشد درجہ کی رحمت پائی جاتی ہے جو اپنے الطاف کے ساتھ خود ہی اپنے بندوں پر مہربانی کرتا ہے۔ (ل) اور رَأْفَةٌ جس سے یہ مشتق ہے رحمت سے زیادہ خاص اور زیادہ رقت والی شے ہے۔ (ل)

181- ﴿تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ تَقَلُّبٌ۔ قَلَبَ سے ہے اور اس کے معنی بار بار پھیرنا ہیں۔ فِيْ یہاں بمعنی اِلٰی ہے۔ وَجْهٌ توجہ یا منہ۔

توجہ یا منہ کے بار بار آسمان کی طرف پھیرنے سے مراد: اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنا یا اس کی طرف سے کسی امر کا انتظار کرنا ہے۔ مگر یہاں مراد اس حکم کا انتظار نہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے۔ کیوں کہ وہ حکم نازل ہو چکا اور اس پر اعتراضات کا جواب بھی ہو چکا۔ بلکہ یہ انتظار یا توجہ یا دعا اس لیے ہے کہ خانہ کعبہ جو مشرکین کے قبضہ میں ہے اور جسے اب قبلہ بنایا جاتا ہے کب بت پرستی سے پاک ہوگا اور مسلمانوں کا اس پر کب قبضہ ہوگا۔

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ﴾ وَلَّيْتُهُ كَذَا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے فلاں چیز کا والی یا متصرف بنا دیا۔ (غ۔ر) یہی معنی یہاں مراد

اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ جانتے ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے سچ ہے اور اللہ

ہیں۔ منہ پھیرنے کے معنی نہیں۔ اس لیے کہ یہ آئندہ کے متعلق ہے اور منہ پھیرنے کا حکم پہلے ہو چکا (وَلِیٌ مصدر تَوْلِیَۃٌ) کبھی اقبال کے معنی میں آتا ہے جیسے ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ﴾ یا ﴿لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ یعنی اس طرف متوجہ ہونا اور کبھی انصراف کے معنی میں جیسے ﴿ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ﴾ یا ﴿مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ﴾۔

شَطْرٌ کسی چیز کے نصف یا وسط کو کہتے ہیں اور یہاں مراد اس کی جہت ہے۔ (غ)

اَلْحَرَامُ۔ حَرَامٌ کے معنی ہیں اَلْمَمْنُوْعُ مِنْهُ وہ جس سے روکا جائے خواہ بذریعہ تسخیر الٰہی ہو جیسے ﴿حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ﴾ [الأنبياء: 95:21] ''اور اس بستی پر جسے ہم ہلاک کر دیں لازم ہے۔'' میں (جہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہی ایسا ہے کہ جن پر موت وارد ہو جائے وہ اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے) یا عقل یا شریعت کی رو سے یا کسی حکم کی وجہ سے جس کی اتباع ہوتی ہے یا غلبہ کی وجہ سے اور حرم کو حرم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی رو سے اس میں بہت سی باتیں ممنوع ہیں جو دوسری جگہ کرنی جائز ہیں۔ (غ) اسی مادہ سے محروم ہے۔ گویا وہ شخص جو ایک چیز کے حصول سے روک دیا گیا محروم ہے۔

﴿اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اس وسیع احاطہ کا نام ہے جس کے اندر خانہ کعبہ ہے۔ یہ احاطہ کوئی دوسو پچاس قدم لمبائی میں اور دوسو قدم چوڑائی میں ہے اور خانہ کعبہ اس کے قریباً وسط میں واقع ہے جو لمبائی میں اٹھارہ قدم اور چوڑائی میں چودہ قدم ہے اور اس کے شمال مشرقی کونہ پر حجر اسود ہے۔ مگر بعض وقت المسجد الحرام کل حرم پر بول دیا جاتا ہے۔ جس کے اندر خود مکہ معظّمہ اور میدان منیٰ اور عرفات واقع ہیں اور جس کے اندر جنگ کرنا یا ہتھیار اٹھانا یا شکار کرنا یا گھاس وغیرہ (سوائے اذخر کے) کاٹنا منع ہے۔ جیسے ﴿لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: 196:2] ''جس کے اہل مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔'' یا ﴿لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ [البقرة: 191:2] ''مسجد حرام کے قریب ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ اس کے اندر تمہارے ساتھ جنگ (نہ) کریں۔'' میں۔

خانۂ کعبہ کی تولیت:

خانۂ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ مگر کعبہ کے اندر جو توحید کا مرکز تھا بت بھرے ہوئے تھے۔ تو لازماً یہ خیال رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں پیدا ہوتا ہوگا کہ اس آلائش سے یہ مرکز توحید کب اور کس طرح پاک ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ ہم تم کو ہی اس قبلہ کا متولی بنائیں گے جسے تم چاہتے ہو۔ اور اس کے بعد جو فرمایا فَوَلِّ وَجْهَكَ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حکم ابھی ملتا ہے۔ کیونکہ یہ عبارت تو بے معنی سی ہو جاتی ہے کہ ہم تیرا منہ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ پس تو بھی اپنا منہ پھیر لے۔ بلکہ اصل مراد اسی خیال کا ازالہ ہے کہ خانہ کعبہ میں بت ہیں تو فرمایا کہ اس وجہ سے مضائقہ نہ کرو۔ کیونکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے اور یہ مرکز توحید موحدین کے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ اس لیے بغیر کسی خیال کو دل میں لانے کے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب خانہ کعبہ کا متولی کوئی غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔

بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

اس سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں۔ (182)

وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے سب نشان بھی لے آئے وہ تیرے قبلہ کی تابعداری نہ کریں گے اور نہ تو ان کے قبلہ کا تابع ہے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں۔ اور اگر تو ان کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے پاس علم سے آچکا تو بے شک اس وقت تو ظالموں میں سے ہوگا۔ (183)

وقف لازم

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ

وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے

182- اہل کتاب پر رسول اللہ ﷺ کی صداقت پوری طرح کھل چکی تھی۔ پیشگوئیاں ان کی کتاب میں موجود تھیں جن کے پورا ہونے کا ابھی تک ان کو انتظار تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ وعدہ تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو عرب میں چھوڑا گیا۔ بیت ایل سوائے عرب کے اور کہیں نہ تھا یعنی خانہ کعبہ کے سوائے کوئی گھر بیت اللہ نہیں کہلایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اسی گھر سے تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں یہاں موجود تھیں۔ پس جب ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا موعود نبی آیا تو ضروری تھا کہ اس کا قبلہ بھی کعبہ ہوتا۔ اس لیے بھی کہ وہ جانتے تھے کہ نبی موعود عرب میں ظاہر ہونے والا ہے۔ بلکہ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودی ملک عرب میں کثرت سے آکر آباد ہو گئے تھے اور ان کی پیشگوئیوں میں اب تک بھی صراحت سے عرب کا نام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ [یسعیاہ: 13:21] میں ان الفاظ کے بعد ''عرب کی بابت الہامی کلام'' آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی صاف پیشگوئی ہے۔ تو اس قدر روشن نشان آپ کی صداقت کے جمع تھے کہ دل صداقت کا انکار نہ کر سکتے تھے۔

183- قبلہ یہاں دین کے قائمقام ہے کیونکہ یہ ایک ظاہر اور کھلا نشان دین کا تھا اور حدیث [لَا تُكَفِّرْ أَهْلَ قِبْلَتِكَ] (اساس البلاغة، جلد1، صفحہ 409) میں بھی اسی طرف اشارہ ہے اور یہ جو فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں میں یہودیوں کا قبلہ اور تھا اور سامریوں کا اور۔ پھر یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا تو عیسائیوں نے بجائے اس کے مشرق کو اپنا قبلہ قرار دیا۔ مسلمانوں میں بہت سے اختلافات کے باوجود قبلہ کا اختلاف نہیں ہوا اور وہ اصول دین پر بھی مجتمع ہیں۔

وقف منزل لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ — ایک فریق یقیناً حق کو چھپا تا ہے اور وہ جانتے ہیں۔(184)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع 17 6 1 — (یہ) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس ہرگز جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو۔(184)

وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ — اور ہر ایک کے لیے ایک طرف ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے پس نیکیوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر لو۔(185)

وقفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

184- **اہل کتاب کا آنحضرت ﷺ کو شناخت کرنا:** نبی کریم ﷺ کی صداقت بوجہ ان پیشگوئیوں اور وعدوں کے جو اہل کتاب کو دیئے گئے تھے ان پر واضح ہو چکی تھی۔ مگر محض اس حسد کی وجہ سے قبول نہ کیا کہ بنی اسرائیل میں سے نہیں۔ دوسری جگہ بھی ہے ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ [البقرة: 89:2] ''مگر جب ان کے پاس وہ آیا جسے انہوں نے پہچانا اس کا انکار کر دیا۔'' تمام علامات شناخت یقینی طور پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس لیے اسی طرح آپ کا نبی موعود ہونا پہچانتے تھے جس طرح ایک انسان اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے یا اَبْنَآءَهُمْ سے مراد انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ یعنی جن نشانات سے ان کی صداقت کو پہچانتے تھے وہ سب نشانات یہاں بھی موجود ہیں۔

184- (﴿الْمُمْتَرِيْنَ﴾) مِرْيَةٌ کسی امر میں تردد کو کہتے ہیں جیسے ﴿فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ﴾ [السجدة: 23:32] ''سو تو اس کے ملنے سے شک میں نہ رہ۔'' وغیرہ مقامات پر اور اِمْتِرَاءٌ کے معنی ہیں اَلْمُحَاجَّةُ فِيْمَا فِيْهِ مِرْيَةٌ۔ (غ) یعنی اس امر میں جھگڑنا جس میں تردد ہو۔

یہاں خطاب مخالف کو ہے کیونکہ ابھی فرمایا تھا کہ یہ اہل کتاب جانتے ہیں ﴿اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ تو اس لیے اب فرماتا ہے کہ یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہی ہے۔ پس جھگڑے کو چھوڑ دو اور حق کو قبول کر لو اور یا یہ خطاب عام ہے مگر اس صورت میں بھی مراد مخالف ہی ہیں۔

185- ﴿لِكُلٍّ﴾ سے مراد ہر ایک قوم یا ہر ایک اہل مذہب یا ہر ایک شخص ہے۔

وِجْهَةٌ۔ وَجْهٌ قصد کو اور جِهَةٌ اور وِجْهَةٌ مقصد کو کہا جاتا ہے اور اصل میں جِهَةٌ یا وِجْهَةٌ وہ ہے جس کی طرف ہم کسی چیز کے لیے توجہ کرتے ہیں۔ (غ)

اِسْتَبِقُوْا۔ سَبَقَ اصل میں چلنے میں آگے ہونے کو کہا جاتا ہے اور اِسْتِبَاقٌ کے معنی ہیں تَسَابَقَ یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنا اور چلنے کے علاوہ اس قسم کے تقدم پر بھی بولا جاتا ہے جیسے بزرگی میں سبقت۔ اور ﴿السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ﴾ [الواقعة: 10:56] ''اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہی ہیں۔'' میں اور کئی دوسرے مقامات پر یہی سبقت مراد ہے۔ (غ)

اس رکوع میں ایک قبلہ اور پھر **خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کی وجوہات** بیان فرمائی ہیں۔ مسلمانوں کا اگر ایک ظاہری قبلہ ہے تو ایک ان کے لیے باطنی قبلہ بھی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ دنیا کی ہر قوم نے اپنا ایک مقصد قرار دے لیا ہے اور وہ محض دنیا تک محدود ہے۔ پس اے مسلمانو! تم خیرات اور نیکیوں میں قدم بڑھاؤ، اسی کو اپنا مقصد، اسی کو قبلہ ہمت قرار دو۔ اور ظاہری معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک قوم نے اپنے لیے ایک قبلہ ٹھہرایا ہوا ہے۔ پس تم اس قبلہ کی طرف سبقت کرو جو توحید کا مرکز اصلی ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی خیرات اور نیکیوں کا تم کو حق دار بناتا ہے۔ کیونکہ جس طرح شرک تمام بدیوں کی جڑ ہے۔ توحید سے تمام نیکیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر لِكُلٍّ میں مراد ہر شخص کو لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نماز پڑھنے میں ہر شخص کسی نہ کسی طرف منہ کرے گا اور الگ الگ طرف منہ کرنے میں سب کی توجہ ایک طرف نہیں رہ سکتی۔ اس لیے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو ایک طرف منہ کرنے کی ہدایت کر کے ان میں یک جہتی اور اتحاد کی بنیاد رکھ دی اور اس پر قائم ہو جانا بہت سی نیکیوں کو لے لینا ہے۔ درحقیقت ایک قبلہ پر اتفاق اسلام کی اخوت عالمگیر کی بنیاد ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے [لَا تُكَفِّرْ أَهْلَ قِبْلَتِكَ] اپنے اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو۔

مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے:

خانہ کعبہ کی جو کچھ عزت مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اس کی وجہ سے ہے کہ یہ توحید کا اصل مرکز ہے اور نسل انسانی کے اتحاد کا بھی اصلی مرکز یہی ہے۔ بعض کوتاہ اندیش مخالفین نے اس عزت کو پرستش کا قائم مقام قرار دے کر اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ کسی چیز کی عزت کرنا اور امر ہے اور اس کی پرستش امر دیگر ہے۔ پرستش یا عبادت میں تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ اول اس چیز کی عظمت سے اس قدر متاثر ہونا کہ اس کی طرف توجہ تام ہو۔ دوسرے اس کی حمد و ستائش کرنا۔ تیسرے اس سے دعا مانگنا۔ اب جب ایک مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کرتا ہے تو ان تینوں باتوں میں سے ایک بات کا وہم تک اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ وہ اللہ اکبر کہتا ہوا خدا کی عظمت کے سامنے کبھی دست بستہ کھڑا ہوتا کبھی جھکتا کبھی زمین پر گرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہی حمد و ستائش کرتا ہے اور جو کچھ مانگتا ہے اپنے مالک حقیقی سے ہی مانگتا ہے۔ اس وقت نہ اس کے دل پر خانہ کعبہ کی عظمت کا کوئی اثر ہوتا ہے نہ اس کی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے۔ نہ وہ خانہ کعبہ کی حمد و ستائش کرتا ہے۔ نہ خانہ کعبہ سے کوئی دعا مانگتا ہے۔ پس صرف حالت نماز میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کو خانہ کعبہ کی پرستش قرار دینا محض ایک جاہلانہ اور متعصّبانہ خیال ہے۔ پھر اس وقت بھی تو مسلمانوں کی نماز اسی طرح ہوتی تھی جب خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ہوتے تھے اور بیت المقدس کی طرف منہ۔ تو کیا اس وقت وہ بیت المقدس کی پرستش کرتے تھے؟

خود خانہ کعبہ کے مشرکین عرب نے بھی باوجود اس کی عظمت کے جو ان کے دلوں میں تھی کبھی پرستش نہیں کی۔ وہ ان بتوں کو ضرور پوجتے تھے جو انہوں نے اس کے اندر رکھے ہوئے تھے مگر اس گھر کی پرستش کبھی نہیں کی۔ بلکہ حجر اسود کی بھی جسے بوسہ دیا جاتا ہے عرب میں کبھی پرستش نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ بن گھڑا پتھر تھا نہ اس سے کبھی انہوں نے مرادیں مانگیں نہ اس کو اپنا معبود سمجھا۔ ہاں صرف طواف میں بوسہ دینا ثابت ہے اور مسلمان بھی بوسہ دیتے ہیں۔ مگر یہ محض ایک نشان محبت کے طور پر ہے کیونکہ وہ پتھر

جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ جہاں کہیں تم ہو گے اللہ تم کو اکٹھا کر کے لائے گا اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(186)

خود وہاں ایک نشان کے طور پر لگایا گیا ہے۔ یہی وہ پتھر ہے جس کی طرف حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی زبور میں بھی اشارہ کیا ہے:

''وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا ہے کونے کا سرا ہو گیا ہے۔ یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے۔''

[زبور: 22:118، 23]

یہی وہ بن تراشا پتھر ہے:

''جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا۔''

[دانیال: 45:2]

اب یہ رد کیا ہوا پتھر جو کونے کا سرا ہو گیا ہے۔ ساری مقدس تاریخ کو تلاش کرو تو سوائے بنی اسماعیل کے اور کسی کے لیے نشان نہیں ہو سکتا۔ مسیح کو یہود کا رد کرنا ایک معمولی واقعہ ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آیا۔ مگر بنی اسماعیل کو بنی اسرائیل نے جن کی قوم مدت تک حکمران رہی بالکل رد کر دیا۔ یہاں تک کہ اس قوم کو عہد ابراہیمی سے بھی اپنی طرف سے خارج کر دیا۔ وہ نہ صرف اپنے ملک سے نکال کر ریگستان میں رکھے گئے بلکہ ان کو ہمیشہ کے لیے ردشدہ تصور کر لیا گیا۔ پس یہی وہ پتھر تھا جس کو معماروں نے ردّ کر یا اور اسی کی یادگار میں خانہ کعبہ کا وہ پتھر ہے جو حجر اسود کے نام سے موسوم ہے اور اس کو بوسہ دینا اسی بات کی یادگار ہے کہ وہ ردّ کیا ہوا پتھر کونے کا سرا ہوا۔ اسی کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی **انگورستان والی تمثیل** میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ کہا ہے کہ انگورستان کا مالک جب آئے گا تو انگورستان کو اور باغبانوں کے سپرد کر دے گا۔ یہ انگورستان کیا ہے؟ وہی خدا کی بادشاہت ہے جس کا ذکر خود حضرت مسیح نے تمثیل کو واضح کرنے کے لیے ان الفاظ میں کیا ہے:

''یسوع نے انہیں کہا کہ تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔ یہ خداوند کی طرف سے اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لائے دی جائے گی جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔'' [متی: 43,42:21]

یہاں مسیح نے بنی اسرائیل کو صاف طور پر کہہ دیا کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے کر ایک اور قوم کو دی جائے گی اور وہ قوم کون سی ہے؟ وہ وہی قوم ہے جس کا نشان وہ پتھر ہے جسے راجگیروں نے ناپسند کیا یعنی قوم بنی اسماعیل۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حجر اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے۔

186- **کعبہ کی طرف منہ کرنا اتحاد پیدا کرتا ہے:** ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تم سب کا حشر ایک

وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے، اور یقیناً یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ (187)

وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ

اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اس کی طرف پھیر دو، تاکہ لوگوں کے لیے کوئی دلیل تمہارے خلاف نہ رہے مگر وہ جو ان میں سے ظالم ہیں، سو ان سے مت ڈرو، اور

جگہ کرے گا اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو تم سب پر موت وارد کرے گا۔ اور یوں بھی کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تمہاری نماز کو ایک ہی جہت کی طرف کرے گا۔ (ض) [فَیَأْتِ بِكُمْ مُجَازٌ عَنْ جَعْلِ الصَّلَاةِ مُتَّحِدَةَ الْجِهَةِ] (روح المعانی: جلد2، صفحہ 15) (ر) اور مضمون کے لحاظ سے یہی آخری معنی ہی زیادہ موزوں ہیں۔ یعنی تم خواہ مشرق میں ہو اور خواہ مغرب میں خواہ شمال میں خواہ جنوب میں جہاں بھی دنیا میں پھیلے ہوئے ہو جب تم سب ایک خانہ کعبہ کی طرف منہ کرو گے تو تمہاری نماز اور اس کے ساتھ ہی تم میں ایک اتحاد ہوگا۔

اس میں ظاہر طور پر تو اسی قدر کہا ہے کہ جہاں کہیں تم ہو گے تم سب کی نماز ایک ہی جہت کی طرف ہوگی مگر اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی بھی ہے کہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں دنیا میں ہو گے اللہ تعالیٰ اس اتحاد ظاہری کے ساتھ ایک اور اتحاد قائم رکھے گا اور اگر مذاہب کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اسلام کا یہ ایک امتیازی نشان ہے کہ قومیت اور ملک کی حد بندیوں کو بالکل توڑ دیتا ہے اور مسلمانوں کو وہ کہیں بھی ہوں ایک کرتا ہے۔

187- **قبلہ کی طرف منہ کرنے کے حکم کو تین دفعہ دہرانے میں حکمت:** یہ حکم کہ جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے۔ تین دفعہ دہرایا گیا ہے۔ اول [آیت: 144] میں، دوم [آیت: 149] میں، تیسرے اس آیت میں۔ مگر یہ تین دفعہ لانا تین مختلف غرضوں کے لیے ہے۔ پہلی مرتبہ تو اس اطمینان کے لیے کہا تھا کہ خانہ کعبہ بت پرستوں کے تصرف میں نہ رہے گا بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے اس لیے تم اپنا منہ بے شک ادھر پھیر دو۔ دوسری دفعہ [آیت: 148] میں یہ بتا کر کہ ایک قبلہ پر قائم کرنے سے اصل غرض یک جہتی پیدا کرنا ہے۔ پھر فرمایا کہ جہاں سے نکلو اس کی طرف منہ پھیر لو۔ اور اصل غرض کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تیسری مرتبہ یہاں فرمایا کہ تم اس کی طرف منہ پھیر لو تاکہ لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے یعنی یہ درحقیقت ان پر ایک اتمام حجت ہے۔ اگر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر نہ کیا جاتا تو یہ اعتراض ہوتا تھا کہ جب دعائے ابراہیمی کا موعود نبی آ گیا تو اس

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ﴿۱۵۰﴾

مجھ سے ڈرو۔(188) اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پالو۔(189)

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۱۵۱﴾ معانقة 3

جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔(190)

کا قبلہ بھی وہی گھر چاہیے جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بطور نشان کے چھوڑا گیا تھا۔ چنانچہ [آیت: 151] میں صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ یہ وہی رسول ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

188- **اہل کتاب کا اعتراض کہ کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو ساتھ ملانے کے لیے تھا:** ﴿اِلَّا﴾ یہاں استثنائے منقطع ہے۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے لیے حجت تو اب کوئی باقی نہیں رہی اور اتمام حجت ہو گیا۔ مگر ظالم تو اب بھی نہیں ٹلیں گے۔ یا یہ کہ اب بھی حجت کریں تو یہ ظلم ہے اور ایسا کرنے والے ظالم ہیں۔ یہودی اس وقت کہتے تھے اور عیسائی آج تک کہتے ہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنایا عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا۔ یہ اس شخص کی نسبت کہا جاتا ہے جس نے ہزارہا سال کی بت پرستی، شراب خوری، قمار بازی، زنا کاری، جنگ وجدال اور رسوم قبیحہ کو یوں ملک عرب سے مٹا دیا کہ گویا ان کا نام ونشان ہی نہ تھا۔ کیا اس کو ایک خانہ کعبہ چھڑانا مشکل تھا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ بلکہ اس نے خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھی تو کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ڈیڑھ سال تک برابر نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرتے رہے اور سبھی مسلمان بھی کرتے رہے اور اس عرصہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پس یہ ناحق کی حجت بازی ہے۔

189- **عبادت الٰہی کا پہلا اور آخری گھر:** دوسری غرض یہ بیان فرمائی کہ تاتم پر اتمام نعمت ہو اور تا کہ تم کامل ہدایت پانے والے بنو۔ ان سب چیزوں کا تعلق علم الٰہی میں خانہ کعبہ سے تھا جو خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر دنیا پر تھا۔ **اول را بآخر نسبتے است**۔ جو سب سے پہلا گھر تھا اسی کو دنیا کا آخری قبلہ قرار دیا۔ جہاں سے لوگ روئے زمین پر منتشر ہوئے وہیں پر پھر ان کا اجتماع ضروری ہوا۔ مکہ یوں بھی ناف زمین ہے۔ کیونکہ ملک عرب پرانی دنیا کے عین مرکز میں واقع ہوا ہے۔ دنیا توحید کو بھی بھول گئی تھی اور خانہ کعبہ کو بھی۔ دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس لائے۔

190- **دعائے ابراہیمی کا رسول اور قبلہ ابراہیمی:** یعنی تمہارا قبلہ خانہ کعبہ کو اسی طرح قرار دیا ہے جیسا کہ تم میں دعائے ابراہیمی والا رسول بھیج دیا۔ چنانچہ انہی الفاظ کو یہاں دہرایا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں اوپر آ چکے ہیں۔ یہ اسی طرف اشارہ کرنے کو ہے

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ؏ ﴿۱۵۲﴾ — پس مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔ (191)

ع 18 5 2

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ — اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (192)

کہ جب وہ دعا پوری ہو کر وہ رسول آ گیا تو ضروری ہوا کہ وہ گھر بھی اس کا قبلہ قرار دیا جائے تا کہ تم دنیا میں نیکی کے معلم بنو۔ اسی لیے تحویل قبلہ پر اعتراض کا ذکر کر کے فرمایا تھا ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرۃ: 143:2] ''تا کہ تم لوگوں کے پیشرو بنو۔''

191 - اُذْكُرُوْنِي۔ ذکر کے معنی حِفْظُ الشَّیْءِ ہیں۔ (ت) یعنی کسی چیز کا یاد رکھنا اور یہ دو طرح پر ہے۔ دل سے اور زبان سے۔ اور ان میں سے ہر ایک دو قسم ہے ایک بھولنے کے بعد کسی چیز کا ذکر، دوسرے ہمیشہ اس کا محفوظ یعنی یاد رکھنا۔ (غ) اور ذکر کے معنی ثناء بھی ہیں یعنی تعریف کرنا اور شرف بھی یعنی بزرگی دینا۔ (ت) ﴿اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ﴾ [الزخرف: 44:43] ''یقیناً وہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے مشرف ہے۔'' میں اور ﴿صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ؕ﴾ [ص: 1:38] ''اللہ صادق ہے۔ بزرگی دینے والا قرآن گواہ ہے۔'' میں یہی آخری معنی مراد لیے گئے ہیں۔ اور اَلذِّكْرُ قرآن شریف کا نام بھی ہے۔ یہاں اَذْكُرُوْنِيْٓ میں بندہ کا اللہ کی ثناء کرنا مراد ہے اور اُذْكُرْ میں بندہ کو اللہ کا شرف یا بزرگی دینا۔ دوسرے لفظوں میں مخلوق خدا میں اس کا ذکر پھیلا دینا یا جس طرح قرآن کریم نے بدی کی سزا کا ذکر انہی الفاظ میں کر دیا ہے [دیکھو نمبر: 27] اسی طرح نیکی کی جزا کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کر دیا ہے اور مراد ذکر اللہ کی جزائے خیر دینا ہے۔ یہاں کفر سے مراد ناشکر گزاری یا نعمت کا اخفاء ہے [دیکھو نمبر: 17]۔

اعلائے کلمۃ اللہ سے ہی مسلمان بڑے بن سکتے ہیں:

یہ مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ تم میرا ذکر کرو یعنی میرے نام کو دنیا میں پھیلاؤ تو میں تمہیں بڑا بناؤں گا اور اگر تم اس نعمت کو چھپاؤ تو پھر تمہارے لیے سزا بھی ہے۔ چنانچہ اگلے رکوع کے دو حصے کیے ہیں، ایک حصہ میں ہدایت کے پھیلانے میں مشکلات کے مقابلہ کا اور دوسرے حصہ میں کتمان ہدایت کا ذکر ہے۔ کاش آج مسلمان بڑا بننے کے لیے اس ارشاد الٰہی کی تعمیل کر کے اشاعت اسلام کے کام کو اپنا نصب العین بنائیں۔

192 - صَبْرٌ۔ صَبْرٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 68] اور یہ دو قسم ہے۔ ایک صبر حرام اور گناہ کی چیزوں کے ترک کرنے پر اور دوسرا صبر طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر۔ یہاں یہی دوسری قسم کا صبر مراد ہے کیونکہ جیسا کہ پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ظاہر ہے۔ یہاں مضمون یہ ہے کہ ہدایت کے پھیلانے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا مقابلہ ضروری ہے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو،

مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اور اس کے حصول کے لیے مشکلات:

مسلمانوں کو یہ وعدہ دیا تھا کہ خانہ کعبہ بت پرستوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے۔ یہ ایک بڑا بھاری مقصد تھا ہدایت دنیا میں پھیلانا۔ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ یعنی دنیا میں مزکی اور پیشرو بننا، لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینا، یہ عظیم الشان کام مسلمانوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ اب بتاتا ہے کہ ان مقاصد کا حاصل کرنا آسان نہیں بلکہ اس میں بڑی بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ ان مشکلات کے اندر مدد اللہ تعالیٰ سے چاہو۔ مگر دو ذریعوں سے ایک صبر کے ساتھ یعنی طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر مضبوط رہو اور جو تکلیفیں ان میں پیش آئیں ان کی پروانہ کرو اور دوسرے نماز کے ساتھ یا دعا یعنی توجہ الی اللہ کے ساتھ۔ کیونکہ نماز بھی اصل میں دعا ہی ہے۔

صبر اور صلوٰۃ کا مفہوم دو ضدوں کا ظاہر کرنے والا ہے۔ صبر کمال درجہ کی مضبوطی کا نام ہے۔ یہاں تک کہ انسان کسی مشکل اور رکاوٹ کی پروانہ کرے۔ صلوٰۃ کمال درجہ کی عاجزی اور توجہ تام کا نام ہے یہاں تک کہ انسان اپنے مالک کے سامنے گر جائے۔ صبر اس علو کے مقام کو ظاہر کرتا ہے جو انسان کل دنیا کے مقابلہ پر اختیار کر سکتا ہے۔ صلوٰۃ اس انتہائی عاجزی کے مقام کو ظاہر کرتی ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اختیار کرنا چاہیے۔ ان دونوں صفات کو اپنے اندر جمع کرنے سے ہی انسان کمال کو حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی دنیا اور دنیا کی مشکلات اور دنیا کے جبارین کے سامنے علو اور مضبوطی دکھائے، اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی دکھائے۔ عاجزی اور توجہ الی اللہ سے اس کے سامنے راہیں کھل جاتی ہیں، مضبوطی اختیار کر کے ان راہوں پر چل سکتا ہے۔ اگر راہ ہی نہ کھلے تو مضبوطی کس کام کی۔ اگر راہ کھل جائے اور اس پر مضبوطی سے قدم مارنے والا نہ ہو تو راہ کھلنے سے فائدہ کیا۔ اس لیے نہ خالی صبر کمال انسانی تک پہنچاتا ہے نہ نری صلوٰۃ۔

دو موقعوں پر استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا ذکر اور دونوں میں فرق:

یہی حکم صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہنے کا پہلے بھی سورۃ کے شروع میں آچکا ہے۔ وہاں بنی اسرائیل کو کہا تھا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہو تو پیغمبر کی صداقت تم پر کھل جائے گی۔ مگر اس موقعہ پر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ، اور یہاں صبر کے ذکر کو جاری رکھا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ یہ فرق اس لیے ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی شناخت میں زیادہ ضرورت عاجزی اور دعا کی ہے اور کامیابیوں کے حصول میں زیادہ ضرورت صبر یعنی مضبوطی کی ہے۔ اس لیے ہر موقعہ پر جس کی زیادہ ضرورت تھی اس کے ذکر کو جاری رکھا۔ چنانچہ اس رکوع میں بلکہ آگے دور تک صبر کا ذکر ہی چلتا ہے۔ دیکھو ﴿وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ﴾ [البقرۃ: 177:2] ''اور صبر کرنے والے تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت۔'' اس سے قرآن کریم کا اعجازی کلام ہونا ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح ہر موقعہ پر اس کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ہاں یہ باریک فرق بہت تدبر کو چاہتے ہیں اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ قرآن شریف کو پڑھے اور اس پر غور کرے۔

اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم محسوس نہیں کرتے۔(193)

193- ﴿سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ سَبِيْلٌ اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت ہو اور اس کی جمع سُبُل آتی ہے۔ پھر ہر ایک اس ذریعہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں جیسے: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ﴾ [النحل: 125:16] ''اپنے رب کے رستے کی طرف۔'' ﴿اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾ [بني إسرائيل: 42:17] ''تو یہ ضرور عرش کے مالک کی طرف رستہ ڈھونڈ نکالتے۔'' پس سبیل اللہ وہ راہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنكبوت: 69:29] ''اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائیں گے۔'' یہ راہ جہاد ہے اسی لیے امام رازی نے لکھا ہے کہ فی سبیل اللہ عرف قرآن میں جہاد کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ جہاد قتال نہیں مگر اس جہاد کے لیے بعض وقت قتال کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور یہ اس وقت جب ان راہوں پر چلنے سے تلوار کے ذریعہ سے روکا جاتا ہے۔

اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ نہیں:

جب صبر کی ضرورت بتائی تو اب ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو صبر میں کمال دکھاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں۔ کہنے والے کون تھے؟ دوسری جگہ منافقوں کا قول مذکور ہے ﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا﴾ [آل عمران: 156:3] ''اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے۔'' اور مراد چونکہ صرف ایک امر کا ظاہر کرنا ہے اس لیے ہر مخاطب مراد ہے۔

ان کی زندگی کا مفہوم:

اس سے کیا مراد ہے کہ ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں؟ امام راغب نے اس کے ایک معنی یوں کیے ہیں کہ یہاں نفی موت سے مراد غم اور ناکامی کی موت ہے۔ موت کے اس معنی کی تائید میں انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے ﴿وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ﴾ [إبراهيم: 17:14] ''اور ہر طرف سے اسے موت آرہی ہوگی اور وہ مرے گا نہیں۔'' اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں کام کرتے ہوئے مارے جائیں ان پر حزن و ناکامی کی موت نہیں آتی۔ اس لیے ان کو ناکام مت کہو بلکہ وہ کامیاب ہوں گے۔ اس صورت میں یہ استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا نتیجہ بتایا کہ ایسے لوگ ناکام کبھی نہیں ہوں گے۔

کافر کی بعد موت زندگی حیات نہیں:

اگر عام معنی لیے جائیں تو ظاہر ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ حالانکہ کافر موت کے بعد مطلق نیستی سمجھتے تھے۔ وہ زندگی بے شک سب کے لیے ہے نیکوں کے لیے بھی اور بدوں کے لیے بھی۔ مگر بدوں کے لیے چونکہ اس زندگی میں عذاب ہے جس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ﴿لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى﴾ [طٰهٰ: 74:20] ''وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔'' وہ زندگی تو ضرور ہے اس لحاظ سے کہ نیستی نہیں مگر اس کو حیات یا زندگی بھی نہیں کہہ سکتے۔ پس زندگی حقیقت میں نیکوں کے لیے ہی

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۙ﴿۱۵۵﴾

اور ضرور ہم کسی قدر ڈر اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہارا امتحان کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو۔(194)

ہے۔ پھر بالخصوص وہ لوگ جو یہاں شہید کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ جیسے انبیاء علیہم السلام یا ان کے کامل متبعین جن کو صدیق اور شہید کہا گیا ہے یا وہ لوگ جو اپنی جانیں خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں یہ لوگ اپنے مشاہدہ یا یقین سے گویا عینی گواہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ہو جاتے ہیں اور وہ حجاب جو اکثر اہل دنیا کی صورت میں اس عالم میں رہتا ہے ان کی صورت میں اٹھ جاتا ہے وہ اسی زندگی میں ایک نئی زندگی پا لیتے ہیں اور موت کے ساتھ ہی ان کی وہ نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو خصوصیت سے احیاء یعنی زندہ کیا گیا ہے۔

شہداء کی موت اور ان سے استمداد کا ناجائز ہونا:

جن لوگوں نے ظاہر الفاظ پر زور دے کر اس آیت کے یہ معنی کرنے چاہے ہیں کہ شہداء کبھی مرتے ہی نہیں اور پھر اس خیال کو شرک کی حد تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ ان سے استمداد کرتے ہیں بلکہ بعض بیہودہ باتوں کا اعتقاد بھی ان کے متعلق رکھتے ہیں وہ قرآن شریف کے منشا سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ انبیاء، صدیق، شہید، صالح سب مرتے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ [الزمر: 30:39] ''تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔'' اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ شہداء کی روحیں (نہ جسم) جنت میں سبز پرندوں کی صورت میں ہوں گی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے [إِنَّ أَرْوَاحَ الشُّهَدَاءِ عِنْدَ اللهِ فِي حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضْرٍ تَسْرَحُ فِي أَنْهَارِ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ] (مسند الطیالسی: جلد1، صفحہ 233) اور ایک حدیث میں بجائے حَوَاصِلِ کے صُوَرٌ کا لفظ ہے اور دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مر کر انسان عالم الغیب نہیں بن جاتا کہ اس عالم میں کوئی شخص کچھ دعا کرے تو اس کا علم ایک ولی یا شہید کو ہو جائے۔ عالم الغیب صرف ایک اللہ کی ذات ہے وہی سب کی دعائیں سنتا ہے اور وہی حاجات کو پورا کرتا ہے۔ نیک لوگ ہمارے لیے شفیع ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو شفاعت کو ہمارے حق میں قبول بھی فرماتا ہے۔ مگر موت کے بعد وہ عالم برزخ میں جاتے ہیں اور اس عالم کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور نہ قرآن وحدیث سے بعد موت ان سے استمداد جائز ثابت ہوتی ہے۔

194 - **مصائب میں حکمت:** خدا کی طرف سے بَلٰی اظہار کمالات کا نام ہے [دیکھو نمبر: 155]۔ نیکوں پر جو تکالیف آتی ہیں جن میں اظہار صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان کی حکمت یہاں بیان کی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے اندرونی کمالات ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کوئی قوم بڑی نہیں بنتی اور نہ کوئی انسان بڑا بنتا ہے جب تک کہ مصائب کی کٹھالی میں نہ پڑے۔ پس قضاء وقدر کے مصائب انسان کو بڑا بنانے کے لیے ہیں نہ عذاب کے طور پر۔ اصطفا کے رنگ میں نہ ہلاکت کے طور پر۔

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں ہم اللہ کے لیے ہی ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔[195]

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

یہی وہ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے اور یہی وہ ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں۔[196]

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ

صفا اور مروہ اللہ کے نشانوں میں سے ہیں۔[197] پس جو

صحابہ کا کمال صبر:

اس آیت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمال صبر پر شہادت ملتی ہے۔ وطن، گھر بار، اموال، جائدادیں سب کچھ چھوڑ کر اور صرف دین کو لے کر مدینہ پہنچے مگر یہاں ابھی اور مصائب کی خبر سنائی جاتی ہے۔ کس قدر کمال صبر ہے کہ اس سے گھبراتے نہیں بلکہ ان نئے مصائب کو خدا کی راہ میں خوش دلی سے برداشت کرتے ہیں۔

195- ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ مصیبت کے وقت **اس کلمہ کا منہ پر آنا رضا بالقضا اور مقام توحید کا نہایت بلند مقام ہے۔** اس میں یہ بتایا کہ اگر مال و جان کا کچھ نقصان ہوا تو یہ چیزیں انسان کی زندگی کا اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے آپ کو لگا دینا ہے۔ دنیا کی چیزیں جن سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں محض خدا کی امانتیں ہیں وہ جب چاہے اپنی امانتوں کو واپس لے لے۔ ہم خود بھی اس کی امانت ہی ہیں۔

196- ﴿صَلَوٰتٌ﴾۔ صَلٰوۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی دعا ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اپنے بندوں کے حق میں اس کا تزکیہ یعنی گناہوں سے پاک کرنا ہے۔ (غ) یا بندہ یا فرشتہ کی صلوٰۃ بندہ کے حق میں دعائے مغفرت ہے اور اللہ کی صلوٰۃ خود مغفرت ہے۔ علاوہ صلوٰۃ کے رحمت کا لفظ بھی فرمایا۔ یعنی صرف حفاظت ہی نہیں فرماتا بلکہ انعام و احسان بھی کرتا ہے۔

197- ﴿الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ﴾ صَفَا (صَفَاۃٌ کی جمع) صاف پتھروں کو کہتے ہیں اور مَرْوَۃٌ چھوٹے کنکروں کو۔ مکہ معظّمہ کے پاس دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نام ہیں۔

﴿شَعَآىِٕر﴾۔ شَعِیْرَۃٌ کی جمع ہے اور یہ شعر سے ہے جس کے معنی ہیں باریک علم حاصل کیا [دیکھو نمبر: 21]۔ اور شَعَآئِرٌ سے مراد ہر ایک وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے عَلَمٌ بنائی گئی ہو۔ اس لیے اعمال حج کو شعائر اللہ کہا گیا ہے یا شعائر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ معالم یعنی نشان ہیں جن کے قیام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس لیے قربانیوں وغیرہ کو بھی شعائر اللہ فرمایا ہے۔ (ت)

حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو کوئی شوق سے نیکی کرتا ہے تو اللہ بڑا قدر دان جاننے والا ہے۔(198)

صفا اور مروہ کے ذکر میں یہاں دوہرا اشارہ ہے:

ایک تو صبر کے مضمون کے متعلق۔ کیونکہ صفا اور مروہ وہ مقام ہیں جہاں حضرت ہاجرہ علیہا السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑتی تھیں ان کے عظیم الشان صبر کا یہ ثمرہ اللہ تعالیٰ نے دیا کہ ان دو پہاڑوں کو الٰہی نشان قرار دیا اور ہمیشہ کے لیے اس صبر کے نمونہ کی یادگار بنایا۔ جب حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بے آب و گیاہ بیابان میں چھوڑا تو انہوں نے صرف اس قدر دریافت کیا [آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهَذَا؟] کیا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم آپ کو دیا ہے کہ ہمیں یہاں چھوڑ دو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ تو انہوں نے کہا [إِذًا لَّا يُضَيِّعُنَا] (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الحج، باب بَدْءِ السَّعْيِ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ: 9639) پھر اللہ تعالیٰ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس کی طرف یہاں اشارہ کر کے یہ بھی بتا دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہاجرہ علیہا السلام کو یہاں چھوڑنا حضرت سارہ علیہا السلام کی خوشی کے لیے نہ تھا جیسا کہ بائبل میں مذکور ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تھا۔ پس دوسرا اشارہ صفا اور مروہ کے ذکر میں یہ بھی ہے کہ یہی وہ مقام ہے جس کا تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہے اور آپ کو یہاں چھوڑنے کے یہی معنی تھے کہ اس مقام سے ان کا کوئی خاص تعلق ہے۔

198- ﴿حَجَّ﴾۔ حَجّ کے معنی [نمبر: 101] میں بیان ہو چکے ہیں۔ عرف شریعت میں قصد بیت اللہ کا نام ہے۔

﴿اِعْتَمَرَ﴾۔ عِمَارَةٌ آباد کرنا ہے ﴿وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا﴾ [الروم: 9:30] ''اور اسے آباد کیا، اس سے بڑھ کر جو انہوں نے آباد کیا۔'' اور عمر گویا وہ مدت ہے جس میں روح سے جسم آباد رہتا ہے اور اِعْتِمَارٌ اور عُمْرَةٌ کے معنی ہیں زیارۃ کرنا جس میں محبت کی عمارۃ یعنی اس کا قائم رکھنا ہے اور شریعت کی اصطلاح میں بیت اللہ کا قصد ہے۔ اور حج اور عمرہ میں فرق یہ ہے کہ حج صرف خاص ایام ماہ ذی الحج میں ہوتا ہے اور عمرہ ہر وقت ہو سکتا ہے اور حج میں میدان عرفات میں اجتماع ہوتا ہے۔ عمرہ میں نہیں۔

﴿جُنَاحٌ﴾۔ جَنَاحٌ پرند کے بازو کو کہتے ہیں اور ہر چیز کے دو طرفوں کو اس کے جناح کہا جاتا ہے۔ ﴿وَ اضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾ [طٰهٰ: 22:20] ''اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگا۔'' میں جناح سے مراد جانب ہے اور جَنَحَ کے معنی ہیں مائل ہوا۔ ﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [الأنفال: 61:8] ''اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا۔'' اور گناہ جو انسان کو حق سے ایک جانب مائل کر دے جُناحٌ کہا جاتا ہے۔

﴿يَطَّوَّفَ﴾۔ طَوَافٌ کسی چیز کے گرد گھومنے کا نام ہے۔ یہاں صفا اور مروہ کے طواف سے مراد سعی بین الصفا والمروۃ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

جولوگ اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے کھلی باتوں اور ہدایت سے اتارا ہے اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کھول کر کتاب میں بیان کر دیا۔ یہی ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنیوالے ان پر لعنت کرتے ہیں۔ (199)

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور کھول کر بیان کر دیا ان پر میں (رحمت کے ساتھ) متوجہ ہوتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

﴿تَطَوَّعَ﴾۔ طَوْعٌ کے معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری کے ہیں اور اسی سے اطاعت اور استطاعت ہے اور اسی سے ہی ﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ﴾ [المآئدۃ: 30:5] ''سو اس کے نفس نے اسے بھائی کے قتل پر راضی کر دیا۔'' جو اطاعت سے ابلغ ہے اور تَطَوَّعَ کے معنی ہیں تَحَمَّلَهٗ طَوْعًا یعنی برضا و رغبت ایک بوجھ اٹھایا۔ (غ) اس لیے تطوع وہ عبادت ہے جو انسان خوشی سے اختیار کرتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ **انصار سعی بین الصفا والمروۃ میں کچھ مضائقہ کرتے تھے** اور بعض کہتے ہیں کہ صفا اور مروہ پر دو بت اساف اور نائلہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس رکن حج کو بجالانے میں حرج نہیں۔ گویا یہ ایک پیشگوئی تھی کہ وہ بت نہیں رہیں گے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ سعی بین الصفا والمروۃ نہ کرے تو بھی حرج نہیں کیونکہ اس کا ارکان حج میں سے ہونا احادیث صحیحہ اور تعامل امت سے ثابت ہے۔ پس اشارہ صرف یہی ہے کہ سردست ان حالات میں بھی ارکان حج کو نہ چھوڑو۔ عروہ نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اس آیت کی رو سے اگر سعی بین الصفا والمروۃ نہ کی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اگر یہ منشا ہوتا تو عبارت یوں ہوتی [فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَّا يَطَّوَّفَ] حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے قصہ کی طرف اشارہ کر کے پھر مضمون کو عام کر دیا کہ جو کوئی بھی شوق سے نیکی کرتا ہے اسی کو بہتر بدلہ ملتا ہے کسی انسان سے اس کی خصوصیت نہیں۔

199- ﴿يَكْتُمُوْنَ﴾۔ ایک چیز کے اظہار کو عمداً ترک کر دینا باوجودیکہ اس کی حاجت معلوم ہوتی ہو کَتْمَ یا کِتْمَانٌ کہلاتا ہے۔

کتمان ہدایت اور اس کے نتائج:

کتمان ہدایت سے وہی مراد ہے جو پچھلے رکوع کے آخر میں کفران نعمت سے مراد ہے۔ تعلق مضمون کے لیے [دیکھو نمبر: 191]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

جو کافر ہوئے اور مر گئے درآنحالیکہ وہ کافر ہی تھے یہی ہیں کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔[200]

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

اسی میں رہیں گے نہ ان کا دکھ ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود

ہدایت کا چھپانا یہ ہے کہ انسان اس پر عمل نہ کرے دوسروں کو اس کی طرف نہ بلائے۔ اشارہ بالخصوص یہودیوں کی طرف ہے جو اس زمانہ میں کتمان ہدایت کرتے تھے مگر مسلمانوں کا بھی نقشہ کھینچ دیا ہے۔ آج مسلمان نہ خود قرآن پر عامل ہوتے ہیں نہ دوسروں کو قرآن کی طرف بلاتے ہیں۔ اس لیے وہی بلائیں جن کے مستحق یہود تھے آج مسلمانوں کے لاحق حال ہو رہی ہیں۔ خدا کی رحمت سے دور پڑے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص سے علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔ یہاں اللہ کے لعنت کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کا ان کو اپنی رحمت سے اور اپنی جناب سے دور کر دینا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والوں کی لعنت اپنی اپنی حالت کے مطابق ہے۔ مثلاً فرشتوں کی لعنت یہ ہے کہ وہ نیکی کی تحریک سے دور ہو جائیں۔ لوگوں کی یہ کہ ان کو گھروں سے نکال دیں۔ یہودیوں کے لیے ان لعنتوں کا ذکر [استثنآء: 28:15-20] میں ہے:

''تو شہر میں لعنتی ہوگا اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا ۔۔۔ تیرے بدن کا پھل تیری زمین کا پھل ۔۔۔ لعنتی ہو جائیں گے۔ تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا۔''

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہود کے ان تذکروں سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنچایا تھا اسے انہوں نے ایک عظیم الشان امانت کے طور پر دوسرے لوگوں تک پہنچانے میں کمال احتیاط اور مستعدی سے کام لیا۔ ایک طرف اگر اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے میں ایسی احتیاط کی جس کی نظیر نہیں تو دوسری طرف اس کے پہنچانے میں جانیں تک دے دیں۔

200- پچھلی آیت میں توبہ کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اس میں ان کا جو توبہ نہیں کرتے۔ یعنی وہی لوگ جن کا ذکر گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہے اور وہ توبہ نہیں کرتے۔ اللہ کی لعنت رحمت الٰہی سے دور ہو جانا ہے، ملائکہ کی لعنت نیکی کے محرکوں سے بعد یعنی نیکی کی توفیق چھن جانا ہے۔ لوگوں کی لعنت در بدر کیا جانا ہے۔

الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع 19 11 3

نہیں وہ بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنیوالا ہے۔(201)

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪
وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں، اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں کہ اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دے، اور پانی میں جو اللہ بادل سے اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اس کے اندر ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں، اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے، اُن لوگوں کے

201- ﴿اِلٰهٌ﴾۔ اس کا اشتقاق اَلَہَ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے عبادت کی اور اِلٰہ کے معنی معبود ہیں۔ اس کی جمع اٰلِهَةٌ آتی ہے۔ (غ) معبودان باطل پر اس لفظ کا اطلاق ان کے معتقدین کے نقطہ خیال سے ہوا ہے۔

﴿وَاحِدٌ﴾۔ وَحْدَةٌ کے معنی انفراد یا اکیلا ہونا ہیں اور واحد فی الحقیقت وہ ہے جس کی کوئی جزو نہ ہو مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے جس کا کوئی نظیر نہ ہو اس کو بھی واحد کہہ دیتے ہیں۔ جیسے یگانہ کہہ دیتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں واحد ہو تو اس کے معنی ہیں وہ جس کا نہ کوئی جزو ہو سکتا ہے اور نہ ہی جس میں کثرت ہو سکتی ہے۔ (غ) اور اَحَدٌ مطلق سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں بولا جاتا۔ (غ)

جس طرح پچھلے رکوع کی آخری آیت میں اس رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح اس رکوع کی آخری آیت میں اگلے رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی توحید الٰہی۔ اور اس رکوع میں چونکہ صبر کی تعلیم تھی اور صبر کے معنی طاعات پر قائم رہنا ہے اور نیز ہدایت کے پھیلانے کی تعلیم تھی اس لیے بتادیا کہ ہدایت کا اصل الاصول توحید الٰہی ہے۔ اور اسی پر سب سے پہلے انسان کو قائم ہونا چاہیے۔ توحید کی تعلیم جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے کیا ہے؟ اگر ایک طرف واحد کہہ کر یہ بتادیا کہ نہ اس کا کوئی جزو ہو سکتا ہے نہ اس کی ذات میں کثرت ہے اور نہ اس کی صفات میں اس کا کوئی شریک ہے۔ تو دوسری طرف ﴿اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ کہہ کر بتادیا کہ وہی انسان کا حقیقی محبوب اور مطلوب اور مقصود ہے۔ اسی لیے وہ ایک ہی عبادت کے لائق ہے اور دوسری کوئی چیز اس کے ساتھ عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ذات میں بھی واحد ہے اور صفات میں بھی اور عبادت میں بھی مگر وہ انسانوں سے بے تعلق بھی نہیں۔ کیونکہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔

يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ لیے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔(202)

202- ﴿اِخْتِلَافُ﴾۔ خَلْفٌ کے معنی پیچھے ہیں اور اختلاف کے معنی یہاں ایک کا دوسرے کے پیچھے آنا ہے اور اختلاف یہ بھی ہے کہ ہر ایک دوسرے سے الگ رستہ اختیار کرے۔(غ)

﴿نَهَارَ﴾۔ نَهْرٌ کے معنی [نمبر: 39] میں بیان ہو چکے۔ نَهَارٌ وہ وقت ہے جس میں روشنی کا انتشار ہو جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے۔ مگر اصطلاح شریعت میں طلوع فجر سے غروب آفتاب تک نَهَارٌ ہے۔

﴿فُلْكُ﴾۔ کشتی۔ واحد اور جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور فَلَكٌ وہ ہے جس میں سیارے چلتے ہیں اور یہ کشتی کی مشابہت کے لحاظ سے ہے۔(غ)

بَثَّ۔ کسی چیز کو پراگندہ کرنا اور اسے اٹھانا ﴿هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا﴾ [الواقعة: 6:56] ''اڑتا ہوا غبار ہو جائیں گے۔'' اور بَثٌّ غم کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ فکر کو پراگندہ کرتا ہے۔(غ) اور ﴿بَثَّ فِيْهَا﴾ میں یہاں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے وجود میں لانے اور ظاہر کرنے کی طرف اسے جو موجود نہ تھا۔(غ)

﴿دَآبَّةٌ﴾۔ دَبَّ اور دَبِيْبٌ ہلکا چلنے کا نام ہے۔ اور دَآبَّةٌ کا استعمال ہر حیوان پر ہوتا ہے۔(غ) یا ہر ایک زمین پر چلنے والے پر۔(ت)

﴿تَصْرِيْفِ﴾۔ صَرْفٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا اور یہی معنی تصریف کے ہیں مگر اس میں کثرت پائی جاتی ہے۔

﴿رِيَاحِ﴾۔ اس کا واحد رِيْحٌ ہے اور یہ اس ہوا کو کہتے ہیں جو حرکت میں ہو۔ عموماً قرآن شریف میں جہاں یہ لفظ واحد آیا ہے وہاں مراد عذاب ہے اور جہاں جمع رِيَاحٌ آیا ہے وہاں مراد رحمت ہے۔(غ) واحد کی مثالیں ہیں ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا﴾ [القمر: 19:54] ''ہم نے ان پر ایک آندھی چلائی۔''، ﴿كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ﴾ [آل عمران: 117:3] ''جیسے ہوا، جس میں سخت سردی ہو۔''، ﴿اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ﴾ [إبراهيم: 18:14] ''جس پر ہوا زور سے چلے۔'' اور جمع کی مثالیں ہیں ﴿وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ﴾ [الحجر: 22:15] ''اور ہم (پانی سے) بھری ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں۔''، ﴿يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ﴾ [الروم: 46:30] ''وہ ہواؤں کو خوشخبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے۔'' اور ﴿يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا﴾ [النمل: 63:27] ''ہواؤں کو خوش خبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے۔'' اسی لیے ایک روایت میں نبی کریم ﷺ کی یہ دعا ہے: [اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا، وَّلَا تَجْعَلْهَا رِيْحًا] (مشکل الآثار، جلد2، صفحہ 379) ''اے اللہ! ہم پر (بادصبا) ہوائیں بھیج اور ہم پر آندھی نہ بھیج۔''(د)

﴿سِحَابُ﴾۔ سَحْبٌ کے اصل معنی جَرٌّ یعنی کھینچنا ہیں ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ﴾ [القمر: 48:54] ''جس دن آگ کے اندر اپنے مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔'' اور سَحَابٌ بادل کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ پانی کو کھینچ لاتا ہے۔

﴿مُسَخَّرُ﴾۔ تَسْخِيْرٌ یہ ہے کہ بوجہ غلبہ کے خاص غرض کی طرف چلائے یعنی خاص کام میں لگا دے۔(غ) پس مُسَخَّرٌ وہ چیز

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا (اس کے) ہمسر بنا لیتے ہیں ان سے اللہ کی محبت کی طرح محبت کرتے ہیں اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت بہت بڑھ کر رکھتے ہیں اور اگر وہ جو ظالم ہیں دیکھیں، جب عذاب کو دیکھیں گے کہ سب طاقت اللہ کے لیے ہی ہے اور کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (203)

ہے جو خاص کام میں لگا دی گئی اور اس کا مادہ سَخَرَ ہے جس کے معنی ہیں دوسرے کی تحقیر کے لیے اس پر ہنسنا۔

مناظر قدرت سے توحید باری کی شہادت:

جب ہدایت کے پھیلانے کے لیے مصائب کے مقابلہ کو بھی ضروری قرار دیا تو اب بتاتا ہے کہ ہدایت کی جڑ خدا کی ہستی اور اس کی توحید ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس پر اگر ایک طرف مناظر قدرت سے شہادت ملتی ہے تو دوسری طرف فطرت انسانی بھی اس پر گواہی دے اٹھتی ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں مناظر قدرت کی شہادت کو پیش کیا۔ مگر مناظر قدرت بھی وہ پیش کیے ہیں۔ جن سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں۔ پہلے خود زمین و آسمان کی پیدائش ہے جو کچھ زمین و آسمان کے اندر ہے وہ اس میں آ گیا۔ پھر تغیرات زمانہ ہیں۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات مناظر قدرت تو سب اس میں آ گئے۔ پھر ان کی تفصیل کی ہے اور اس تفصیل میں سب سے پہلے کشتی کا سمندر پر چلنا ہے جو بتاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر مخلوق پر حکومت عطا کی ہے یہاں تک کہ وہ سمندروں پر بھی حکومت کرتا ہے۔ جب مخلوق پر حاکم ہوا تو پھر مخلوق کو معبود بنانے کے کیا معنی۔ پھر اس سمندر کو مردہ زمین پر جگہ جگہ پانی برسانے کا ذریعہ بنایا اور اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ پانی سے سبزیاں اگتی ہیں اور یہی پانی جانوروں کی زندگی کا مدار ہے۔ پھر ان ہواؤں میں جو اس پانی کو جگہ جگہ پہنچاتی ہیں۔ اس بادل کے ذریعہ سے جو آسمان و زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے۔ ان تمام اختلافات کے اندر ایک ہی قانون کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی مدبر بالارادہ ہستی کے تصرف میں ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ سارے عالم میں ایک ہی قانون کام کر رہا ہو۔ یہاں تک کہ آسمان کے ستاروں میں وہی قانون کام کرتا ہو جو زمین کے اندر کر رہا ہے اور اس قانون کے بنانے والے دو ہوں۔

203- ﴿حُبٌّ﴾۔ حَبٌّ اور حَبَّةٌ دانہ کو کہتے ہیں اور حَبَّةُ الْقَلْبِ قلب انسانی کا مرکز ہے۔ پس حَبٌّ اصل میں حَبَّةُ الْقَلْبِ میں اثر کر جانے کا نام ہے۔ (غ)

﴿يَرَى﴾۔ رَأْي جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی علم یعنی جاننا ہوتے ہیں۔ (غ) یہاں جملہ ﴿اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ	جب وہ جو پیشوا بنائے گئے تھے ان سے بیزار ہو جائیں گے
اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ	جو ان کے پیرو تھے اور عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے

﴿لَوْ یَرَی﴾ کا جواب محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ شرک اختیار کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

فطرت انسانی کی شہادت توحید باری پر:

مناظر قدرت سے فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انسان کے دل میں محبت اس چیز کی ہوتی ہے جس سے اسے منفعت پہنچتی ہے اور مناظر قدرت میں جہاں تک غور کرو سب منفعت کے سامان انسان کے لیے خدا تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں۔ پس فطرت انسانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک خدا کی محبت سے ہی قلب لبریز ہوتا۔ مگر مشرک نہ مناظر قدرت پر غور کرتا ہے نہ فطرت کی شہات کی پروا کرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہمسر قرار دے کر ان سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی اسے خدا سے کرنی چاہیے تھی۔

اَنْدَادً یا ہمسروں سے مراد یہاں وہ بڑے لوگ ہیں جن کی فرمانبرداری کر کے لوگ معصیت میں پڑتے ہیں۔ (ج) ہاں مومن کی محبت جو وہ اپنے مالک سے رکھتا ہے اس سے بھی بڑھ کر ہے جس قدر مشرک کو اپنے جھوٹے معبود سے ہوتی ہے۔

عقل اور محبت کا مقام:

پہلی آیت میں اصول کی صحت معلوم کرنے کے لیے عقل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس آیت میں کام کرنے کا اصول محبت بیان فرمایا۔ چنانچہ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ یعنی جب عقل سے کام لے کر انسان ایمان لے آئے تو پھر کام کرنے کے لیے اپنے اندر وہ محبت کا ولولہ پیدا کرے جو تمام ولولوں سے بڑھ کر ہو۔ دنیا میں جس قدر لوگ کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی جذبہ محبت کے ماتحت ہی کرتے ہیں مگر فرمایا کہ مومنوں کا جذبہ محبت خدا کی راہ میں کام کرنے کے لیے سب جذبات محبت سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔ اگر حب وطن یا حب قوم یا کسی پیر یا لیڈر کی محبت کوئی جذبہ محبت پیدا کر سکتی ہے اور انسان سے بڑے بڑے کام کرا سکتی ہے تو ان تمام ولولوں سے بڑھ کر خدائی محبت کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اور صرف اللہ کی محبت کے لیے کام کرنا جس کے سامنے دوسری تمام محبتیں ہیچ ہوں انسان کی زندگی کی اصل غرض ہونی چاہیے۔

﴿اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ کا نظارہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں عملی طور پر نبی کریم ﷺ نے پیدا کر کے دکھا دیا کہ یہ کوئی خیالی مقام نہیں بلکہ ایک قوم نے اس اصول پر کام کیا اور دنیا اور دین کی خیرات ان کے اندر جمع ہو گئیں اور کامیابی کے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر وہ پہنچ گئے۔ آج مسلمان اسی جذبہ محبت سے خالی ہیں۔ قوم اس وقت بنے گی، کامیابی کا منہ اس وقت دیکھیں گے جب خدا کی محبت کے جذبہ کے سامنے تمام دوسرے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ کیسا پر حکمت کلام ہے۔ پہلے بتایا کہ صحیح راہ کو معلوم کرنے کے لیے عقل سے کام لو۔ اور جب اسے معلوم کر لیا، جب خدا کی ہستی کا یقین دل میں بیٹھ گیا تو پھر بتایا کہ محبت کے رنگ میں کام کرو۔ اکثر لوگ دنیا میں عقل اور محبت میں فرق نہیں کرتے اور عقل کی جگہ محبت سے اور محبت کی جگہ عقل سے کام لیتے ہیں۔ اصول دین کو عقل سے نہیں جانچتے بلکہ اندھا دھند مان لیتے ہیں اور کام کرتے وقت عاشقانہ جوش سے کام نہیں کرتے بلکہ سوچ

بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ تعلقات کٹ جائیں گے۔(204)

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع 20 4 4

اور وہ جو پیرو تھے کہیں گے کاش ہمارے لیے پھر کر جانا ہوتا تو ہم ان سے اسی طرح بیزار ہوتے جس طرح وہ ہم سے بیزار ہیں اسی طرح اللہ ان کو ان کے عمل ان پر حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے باہر نکلنے والے نہ ہوں گے۔(205)

میں پڑ جاتے ہیں۔

204- ﴿تَبَرَّأَ﴾۔ بُرْءٌ اور بَرَاءٌ اور تَبَرِّیٌ کے معنی ہیں اس چیز سے الگ ہو جانا جس کے پاس ہونا ناپسند ہو۔(غ) پس بیماری سے اچھا ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور کسی چیز یا شخص سے علیحدگی یا بیزاری پر بھی جیسے: ﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ﴾[التوبة: 1:9] ''یہ (علیحدگی) کا اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے۔''، ﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَ رَسُوْلُهٗ﴾[التوبة: 3:9] ''کہ اللہ اور اس کا رسول ان مشرکوں سے بیزار ہے۔''، ﴿اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ﴾[الممتحنة: 4:60] ''ہم تم سے بے تعلق ہیں۔''، ﴿اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ﴾[الزخرف: 26:43] ''میں اس سے بیزار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔''

﴿اَسْبَابٌ﴾۔ سَبَبٌ کی جمع ہے اور سبب وہ چیز ہے جس کے ذریعہ دوسری چیز تک پہنچا جائے۔(غ) یہاں اسباب سے مراد تعلقات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنا کام نکالتے تھے۔

جھوٹے پیشواؤں اور پیروؤں کی ایک دوسرے سے بیزاری:

یہاں بتایا کہ جن کی محبت کی خاطر یہ لوگ خدا کی نافرمانی کرتے تھے وہ خود ان سے بیزار ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن تو اس بیزاری کا اور قطع تعلق کا نقشہ کامل طور پر ظہور پذیر ہوگا جو جھوٹے پیشواؤں اور ان کے پیروؤں میں واقع ہوگا مگر اس دنیا میں بھی بسا اوقات یہ نقشہ نظر آ جاتا ہے۔ ایک بدمعاش بعض وقت دوسروں کو دل خوش کن نقشے دکھا کر ان کو بدی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن جب اس بدی کے بدنتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ خود بھی گرفتار بلا ہوتا ہے تو پھر اپنے دام افتادوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور وہ جو اس کے دام تزویر میں آ گئے تھے وہ بھی جب بدی کے بدنتائج کو دیکھتے ہیں تو ان پیشواؤں پر لعنت بھیجتے ہیں جنہوں نے ان کو غلط راہ پر ڈالا تھا اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔ بدی کا نتیجہ چونکہ لازماً بد ہے اس لیے جب اس بد نتیجہ کا اثر اپنی ذات پر پڑتا ہے تو اس وقت بدی سکھانے والے اور سیکھنے والے ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بالمقابل جو شخص دوسروں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے اس کے ساتھ تعلق محبت ہمیشہ بڑھتا ہے۔

205- ﴿اَعْمَالٌ﴾۔ عَمَلٌ کی جمع ہے اور عمل ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کو کوئی جاندار قصد سے کرتا ہے۔(غ) فعل بلا قصد ہو سکتا ہے مگر

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸

اے لوگو! اس سے جو زمین میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔(206)

عمل نہیں۔

﴿حَسَرَاتٍ﴾۔ حَسْرَةٌ کی جمع ہے اور حَسِرٌ کے معنی ہیں جس چیز پر کوئی دوسری چیز اڑھائی گئی ہے۔ اس کا اس سے اتار دینا یعنی ننگا کر دینا اور حَاسِرٌ یا حَسِيْرٌ یا مَحْسُوْرٌ تھکے ماندہ کو کہتے ہیں۔ گویا اس کی قوتوں پر سے پردہ اٹھ گیا ہے، یا وہ ظاہر ہوگئی ہے۔ ﴿فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾[بني إسرائيل: 29:17] ''ورنہ تو ملامت کیا ہوا اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا''، ﴿يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾[الملك: 4:67] ''نظر تیری طرف حیرت سے تھک کر واپس آئے گی۔'' اور حَسْرَةٌ غم اور ندامت کا اظہار ہے اس چیز پر جو ہاتھ سے جاتی رہی ہو۔ گویا اس کے قویٰ شدت غم سے ننگے ہو گئے۔ یا قصور کے تدارک کے مقابلہ میں اس پر درماندگی کی حالت طاری ہوگئی۔ (غ)

بدی پر حسرت، عذاب بن جاتی ہے:

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال بد ایسی ندامت کا موجب ہوتے ہیں کہ وہی حسرت ہی اس کے لیے موجب عذاب اور ایک آگ ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾[آل عمران: 156:3] ''تا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں حسرت بنائے۔'' اور ایک جگہ فرمایا: ﴿وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾[الحاقة: 50:69] ''اور یقیناً وہ کافروں کے لیے حسرت ہے۔'' اور پھر اس دلوں کی حسرت کی طرف ہی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝﴾[الهمزة: 104:6-7] خدا کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر بھڑک اٹھتی ہے، یہ بھی فطرت انسانی کی شہادت ہے کہ نیکی پر خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی دکھ کیوں نہ اٹھانا پڑے انسان کے دل میں ندامت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر بدی پر خواہ اس سے کتنا ہی وقتی حظ کیوں نہ ملے آخر فطرت صحیحہ ملامت کرتی ہے یہاں تک کہ انسان اس بدی کا اس قدر عادی ہو جائے کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو جائے۔ مگر بایں بھی فطرت ملامت کرتی ہے خواہ وہ ملامت بدی کے غلبہ کی وجہ سے کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو۔

206- ﴿حَلٰلًا﴾۔ حَلٌّ کی اصل گرہ کھولنے سے ہے ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝﴾[طٰهٰ: 27:20] ''اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔'' اور کسی جگہ اترنے کے وقت بوجھ کے اتارنے پر حَلُّ الْاَحْمَالِ بولا جاتا ہے اس سے مطلق نزول پر حلول کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے: ﴿اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ﴾[الرعد: 31:13] ''یا ان کے گھر کے قریب اترے گی۔'' اور اَحَلَّهٗ کے معنی دوسرے کو اتارا ﴿وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾[إبراهيم: 28:14] ''اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتارا۔'' اسی سے لفظ مَحِلَّهٗ ہے جس کے اصل معنی اترنے کی جگہ ہیں اور حَلِّ عُقْدَہ سے ہی حَلَالٌ کے معنی لیے گئے ہیں۔ گویا وہ چیز اس کے لیے کھول دی گئی یا

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

وہ تمہیں صرف بدی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات بناؤ جو تم نہیں جانتے۔ (206)

آزاد کر دی گئی اور جو شخص حالت احرام سے باہر نکل آئے اسے بھی اسی لیے حلال یا محل کہا جاتا ہے۔ (غ) اور اصطلاح شریعت میں حلال وہ ہے جس کی اجازت شریعت نے دی ہے یا جس سے روکا نہیں۔

﴿خُطُوَاتِ﴾۔ خُطْوَةٌ کی جمع ہے جو چلنے والوں کے دونوں قدموں کے درمیانی فاصلہ کا نام ہے۔ (غ) شیطان چونکہ نافرمانی کی راہوں پر چلتا ہے اس لیے اس کے خطوات سے مراد ہر ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت ہے۔

غذاؤں کا اثر اخلاق پر:

جب ہدایت کے اصل الاصول توحید کا ذکر کیا تو اب کسی قدر ذکر ہدایت کی تفصیلات کا کیا ہے اور بتایا ہے کہ کھانے پینے تک کے احکام بھی شریعت میں دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ غذاؤں کا اثر اخلاق و روحانیت دونوں پر پڑتا ہے۔ یہاں سے لے کر اکتیسویں رکوع تک یہ ذکر چلے گا مگر عموماً انہی احکام کو بیان کیا ہے جن کا تعلق صبر سے ہے کیونکہ یہی اصل مضمون ہے جس پر بحث شروع ہے۔ اس میں سب سے پہلی ضرورت حلال کھانے کی بتائی۔ جو مال باطل طریق پر حاصل کیا جائے وہ حلال نہیں ہوسکتا۔ دوسری ضرورت طیب کھانے کی بتائی یعنی ستھری چیز۔ اس ایک لفظ کو لا کر بہت سی تفصیلات سے مستغنی کر دیا اور کسی قدر اختلاف رواج سے بھی طیب کا اختلاف پیدا ہوسکتا ہے اس لیے عام لفظ رکھا۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ﴾ میں جو حکم دیا ہے وہ عام ہے۔ حرام خوری کو ترک کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں کس طرح مستجاب الدعوات بنوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: [أَطِبْ مَطْعَمَكَ، تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ] (المعجم الأوسط للطبراني، جلد6، صفحہ: 310) ''ستھرا کھانا کھاؤ مستجاب الدعواۃ ہو جاؤ گے۔'' دنیا اور دین ظاہری اور باطنی طہارت کے احکام کو کس طرح ملایا ہے۔

ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق:

خود قرآن شریف نے بھی غذا کے حکم کے بعد یہ لفظ لا کر کہ شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ باطنی طہارت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غذا بھی اچھی کھاؤ۔ اخلاق بھی اچھے دکھاؤ۔ جیسا کہ اگلی آیت میں شیطان کی پیروی نہ کرنے کی وضاحت کر دی کہ بدی اور بے حیائی کی باتوں سے بچو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی اور روحانی حالتوں میں ایک تعلق بتاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جسمانیات کی طرف سے مضمون کو روحانیات کی طرف اور روحانیات سے جسمانیات کی طرف منتقل کرتا ہے۔

206۔ ﴿اَلْفَحْشَآءُ﴾۔ فُحْشٌ اور فَحْشَاءُ اور فَاحِشَةٌ کے معنی ہیں وہ اقوال یا افعال جن کی قباحت بہت بڑی ہو۔ (غ) یا ہر ایک

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے، کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا۔ کیا اگر چہ ان کے بڑے نہ کچھ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔ (207)

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

اور اُن لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے کہ وہ اسے آواز دے رہا ہو جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔ بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ (208)

قبیح خصلت فَاحِشَةٌ ہے۔ (ت) سُوْءٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 105] اور سُوْءٌ اور فَحْشَاءُ میں فرق یہ ہے کہ سُوْءٌ وہ ہے جو اس کے کرنے والے کو نقصان پہنچائے اور فَحْشَاءُ وہ ہے جس کا ذکر کرنا یا سننا بُرا معلوم ہو۔ (ج)

﴿تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ﴾ قَالَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں اس پر افترا کیا۔

بدی اور بے حیائی کا تعلق غذاؤں سے:

یہاں یہ اشارہ ہے کہ حرام غذاؤں کے استعمال سے سُوْءٌ اور فَحْشَاءُ پیدا ہوتے ہیں جیسے مثلاً مردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر برا اثر اور گندے اخلاق، خنزیر کھانے سے بے حیائی اور افترا علی اللہ اسے اس لیے کہا کہ وہ لوگ خود چیزوں کو حلال و حرام قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ آج یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک قسم کی غذا اسی قسم کی صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا۔

207- **تقلید:** قرآن کریم نے بسا اوقات کفار کا نقشہ پیش کر کے مسلمانوں کو سمجھایا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تقلید بھی انہی کا طریق فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ مسلمان اس راہ پر نہ چلیں کہ چونکہ فلاں بات ہمارے بزرگ مانتے آئے ہیں اس لیے اس کے خلاف ہم نہیں سن سکتے۔ مگر آج اندھا دھند تقلید کرنے میں مسلمان سب قوموں پر سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے خیالات کے خلاف بات سن بھی نہیں سکتے۔ غور کرنا تو ایک طرف رہا۔

208- يَنْعِقُ۔ نَعِقَ چرواہے کے بھیڑوں بکریوں کو آواز دینے پر بولا جاتا ہے۔ (غ۔ت)

﴿دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ دُعَاءٌ محض پکارنا یا بلانا ہے اور نِدَاءٌ آواز کا بلند کرنا ہے اور مطلق صوت پر بھی بولا جاتا ہے اور نَدَیٰ اصل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔ (209)

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ

اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے پکارا جائے حرام کیا ہے۔ (210)

میں رطوبت کو کہتے ہیں اور نِدَاءٌ کا استعارہ اس سے لیا گیا ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو اس کی آواز اچھی ہوتی ہے۔ (غ)

عقل سے کام لینے کی ہدایت:

اس تمثیل میں کفار کو جو عقل اور ہدایت کی پروا نہیں کرتے چار پایوں سے تشبیہ دی ہے اور آنحضرت ﷺ کو راعی سے۔ فی الحقیقت انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز عقل ہے۔ پس جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ حیوانوں کے حکم میں ہی ہیں۔ اس لیے آخر پر ان کو بہرے گونگے اندھے کہا ہے۔

209- اِنْ۔ مغنی میں ہے کہ اِنْ بعض وقت بمعنی اِذْ بھی آتا ہے یعنی جب، یہاں یہی معنی ہیں۔ جیسے: ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [المائدۃ: 57:5] ''اور اللہ کا تقویٰ کرو اگر تم مومن ہو'' میں۔ [دیکھو نمبر: 523]

210- اِنَّمَا۔ کلمہ تخصیص ہے۔ صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں مطلب یہ ہے کہ جو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر رکھی ہیں۔ جیسے بحیرہ وغیرہ وہ خدا نے حرام نہیں کیں۔

﴿اَلْمَيْتَةَ﴾۔ مَيْتَةٌ حیوانات میں سے وہ ہے جس کی روح بغیر ذبح کرنے کے نکل جائے۔ (غ) خواہ وہ اپنی موت مرے یا گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا گر جانے سے یا سینگ مارنے سے۔ (ت) قرآن کریم نے یہ تصریح سورۂ مائدہ [آیت نمبر: 3] میں کر دی ہے۔

﴿اَهَلَّ﴾۔ هَلَالٌ پہلی اور دوسری رات کے چاند کو کہتے ہیں اور اِهْلَالٌ چاند دیکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ پھر اس کا استعمال اس آواز پر ہوا ہے جو چاند دیکھنے کے وقت بلند کی جاتی ہے پھر ہر آواز پر۔ (غ)۔ پس ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ وہ ہوا جس پر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کا نام پکارا جائے۔ یعنی ذبح کرتے وقت بجائے اللہ کا نام لینے کے غیر اللہ کا نام لیا جائے جیسے کسی بت کا یا اور کسی کا سوائے اللہ کے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

مگر جو شخص لاچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ بخشنے والا رحم

مردار وغیرہ کی حرمت شریعت سے ہیں:

یہاں ان چیزوں کی حرمت کا ذکر کیا جو اخلاق و روحانیت پر برا اثر ڈالتی ہیں ان کی حرمت کا حکم اس سے پہلے مکہ میں ہی سورۃ الانعام اور سورۃ النحل میں نازل ہو چکا تھا اور چوتھی بار زیادہ تصریح کے ساتھ اس کے بعد سورۃ المائدہ میں نازل ہوا ہے۔ ان چار چیزوں میں سے اول الذکر تین چیزوں کی حرمت کا ذکر یہود کی شریعت میں بھی ہے۔ چنانچہ مردار کی حرمت[أحبار: 15:17] میں، خون کی حرمت[أحبار: 26:7] میں، سور کی حرمت[أحبار: 7:11] میں ہے اور گو عیسائیوں نے سور کو حلال کر کے اسے اپنی محبوب ترین غذا بنا لیا ہے۔

مگر حضرت مسیح کے کلام میں سور کو پلید ہی قرار دیا گیا ہے جیسے: ''اپنے موتیوں کو سوروں کے آگے مت پھینکو'' [متی: 6:7]۔ سوروں کے چرانے کا بھی برے پیرایہ میں ذکر ہے۔[لوقا: 15:15]، پلید روحیں انسان سے نکل کر سوروں کے گلہ میں داخل کی جاتی ہیں۔[متی: 32:8]، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جہاں بعض احکام شریعت موسوی میں ترمیم کی ہے وہاں سور کے گوشت کو ہرگز حلال قرار نہیں دیا۔ بلکہ خود پطرس بھی سور کے ساتھ ان لوگوں کو مشابہت دیتا ہے جو بار بار گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی اس کو ناپاک قرار دیتا ہے۔[پطرس: 22:2]۔

حرمت کی وجہ:

اسلام نے ان تین چیزوں کے علاوہ جن کا اثر صحت جسمانی کے علاوہ اخلاق پر بھی برا پڑتا ہے ایک چوتھی چیز حرام قرار دی ہے یعنی ہر جانور جو ویسے حلال ہو مگر ذبح کرتے وقت اس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور یوں شرک کو عملی رنگ میں جڑ سے کاٹا ہے۔ ان چیزوں کی حرمت کی وجہ دوسری جگہ خود کلام پاک میں دی ہے دیکھو[الأنعام: 145:6]۔ جہاں پہلی تین چیزوں کو رجس کہا ہے یعنی پلیدی۔ گویا ان کا اثر جسم اور اخلاق پر برا ہے اور ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کو فسق کہا ہے۔ مردار اور خون اور سور کے گوشت میں زہروں کا ہونا آج ایک مسلم امر ہے اور اخلاق پر جو بد اثر پڑتا ہے اس پر خود واقعات شاہد ہیں۔ مردار خوار قومیں جیسے ہمارے ملک میں چوہڑے ہمیشہ سے نہایت ذلیل حالت میں رہے ہیں۔ خون پینا درندوں کا کام ہے اور اس سے درندگی پیدا ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے ذبح کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے تاکہ خون بہ جائے۔ سور کے گوشت کھانے سے جو دیوثی اور بے غیرتی انسانوں میں پیدا ہوتی ہے وہ آج کل کی مہذب قوموں کے فحش تعلقات اور عورتوں کے ننگے جسموں سے خود ظاہر ہے۔

سور کا گوشت عرب کے لوگ اسی طرح محبوب رکھتے تھے جس طرح آج یورپ اور امریکہ کی عیسائی اقوام۔ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ اسی لیے

رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

کرنے والا ہے۔(211)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾

وہ جو اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب سے اتارا ہے اور اس کے عوض تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے کچھ نہیں ڈالتے اور اللہ قیامت کے دن اُن سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور اُن کے لیے دردناک دکھ ہے۔(212)

کہا ہے ورنہ جس طرح اس کا گوشت حرام ہے اسی طرح دوسری اشیاء بھی۔ مَیْتَۃٌ سے مچھلی کو حدیث میں مستثنیٰ کیا ہے اس لیے کہ اس میں خون نسبتاً اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس کا اثر بدصحت پر نہیں پڑ سکتا۔

211- ﴿اضْطُرَّ﴾۔ ضَرَّ سے ہے اسی سے ضرورت بمعنی حاجت ہے اور اضطرار باب افتعال ہے جس کی تا کو طا سے بدل دیا ہے اور اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف احتیاج اور اِضْطَرَّہُ کے معنی ہیں اس کو کسی چیز کا محتاج اور اس کی طرف مجبور کر دیا۔ (ت) اور اضطرار انسان کی اپنی بے اختیاری اور دوسرے کے مجبور کرنے سے بھی ہوتا ہے اور ایسی صورت میں بھی کہ خود انسان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیسے غذا۔ (غ)

﴿غَيْرَ بَاغٍ﴾ بَاغٍ۔ بَغٰی سے ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کی خواہش کرنا[نمبر: 115]۔ پس غَيْرَ بَاغٍ سے مراد یہ ہوئی کہ وہ اپنے نفس میں اس کے لیے خواہش نہیں پاتا جیسا کہ مفردات میں ہے [غَيْرَ طَالِبٍ مَا لَيْسَ لَهُ طَلَبُهُ] گویا دل کراہت کرتا ہے۔

﴿وَّ لَا عَادٍ﴾ عَادٍ۔ عَدُوٌّ بمعنی تجاوز سے ہے[دیکھو نمبر: 108]۔ پس لَا عَادٍ سے مراد ہوئی کہ جس قدر کی ضرورت بقائے نفس کے لیے ہے اس سے تجاوز نہ کرے۔

212- **حرمت غذا اور تقویٰ کا تعلق:** اس رکوع کا خاتمہ پھر کتمان ہدایت پر کیا ہے گویا ہدایت کے اصول و فروع کو بیان کر کے پھر اصل مضمون کی طرف توجہ دلا دی ہے اور ساتھ ہی پھر ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ برابر ظاہر سے باطن کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف مضمون کا انتقال کرتا رہتا ہے۔ توحید کے بعد غذاؤں کا ذکر کیا تا معلوم ہو کہ غذائیں بھی انسان کے خیالات پر اثر ڈالتی ہیں۔ غذاؤں کا ذکر کرتے ہوئے پھر کلام کا انتقال باطن کی طرف کیا اور آگ کھانے والوں کا ذکر کیا تا مسلمان قوم یہودیوں کی طرح ظاہر پرست نہ ہو جائے۔ اور حقیقی نیکی اور تقویٰ کو صرف چند ظاہری امور کی پابندی پر محدود نہ کر دے اور اندرونی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ کی راہوں سے غافل نہ ہو جائے۔ آگ کھانے کا محاورہ اسی

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

یہی وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خرید لیا۔ سو ان کا آگ پر جرأت کرنا کیسا عجیب ہے۔ (213)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور جو لوگ کتاب کا خلاف کرتے ہیں وہ یقیناً دور کی مخالفت میں ہیں۔ (214)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ

بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر و لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن

مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے تا جسمانی غذاؤں کی حرمت کو ہی کافی نہ سمجھ لیا جائے۔

خدا کا دوزخیوں سے کلام نہ کرنا:

یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا تو کلام سے مراد محبت کا کلام ہے جو ایک نعمت کے رنگ میں انسان کو دیا جاتا ہے۔ اور یہ فرما کر کہ اللہ ان کو پاک نہیں کرے گا اور نہ ان سے کلام کرے گا یہ بھی بتا دیا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہی گناہوں سے پاک کر دیتا ہے اور ان سے کلام کرتا ہے، وہ گویا اسی عالم میں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کتمان ہدایت میں دونوں باتیں داخل ہیں، خود ہدایت پر عامل نہ ہونا اور دوسروں کو اس کا نہ پہنچانا۔

213- ﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ﴾ صَبْرٌ کے اصل معنی اپنے آپ کو روک رکھنا ہیں۔ مگر بعض وقت جیسے یہاں یہ لفظ جرأت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (غ) اسی کے مطابق مجاہد سے اس کے معنی مروی ہیں کیونکہ صبر اپنے حقیقی معنی میں تو ان کو میسر نہیں۔ صبر تو یہ تھا کہ وہ معصیت سے رکتے۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایسے اعمال کر رہے ہیں جو ان کو آگ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ پس ان اعمال کی جرأت آگ پر جرأت ہے۔ مَا یہاں تعجب کے لیے ہے۔ استفہامیہ یا موصولہ بھی ہو سکتا ہے۔

214- ﴿اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ﴾ اِخْتِلَافٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 202]۔ اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے جیسا کہ ﴿نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ سے ظاہر ہے اور ان کا اختلاف فی الکتاب یہ ہے کہ اس کے بارہ میں طریق حق پر چلنے سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ (ر) یعنی طریق حق پر نہ چلے اور کتاب کے بارہ میں اختلاف سے مراد اس کا رد کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ﴿اِنَّكُمْ لَفِىْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۙ﴾ [الذاریات: 8:51] ''تم صرف مختلف باتیں کہہ رہے ہو'' سے ظاہر ہے اور یہ اختلاف ان کا یہ تھا کہ کبھی اس کو سحر

بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور اپنے اقرار کو پورا کرنے والے جب وہ اقرار کریں۔ اور صبر کرنے والے تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اور یہی متقی ہیں۔ (215)

کہتے، کبھی کہانت، کبھی شعر، کبھی افترا۔ چونکہ یہ امر حق تھا اس لیے اس کے ردّ کرنے میں وہ کسی ایک قول پر قائم نہ رہ سکتے تھے۔

215- ﴿اَلْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ﴾ بِرٌّ کے اصل معنی [اَلتَّوَسُّعُ فِي الْخَيْرِ] ہیں یعنی نیکی میں وسعت اختیار کرنا۔ اس جملہ کی ترکیب ایسی ہے جیسے کہہ دیتے ہیں [اَلْجُوْدُ حَاتَمٌ] مراد ہوتی ہے [اَلْجُوْدُ جُوْدُ حَاتَمٍ] یعنی سخاوت حاتم کی سخاوت ہے۔ اسی طرح یہاں مراد ہے کہ راستبازی اس کی راستبازی ہے جو ایمان لاتا ہے وغیرہ۔ یا چونکہ زبان عربی میں مبالغہ کے وقت صفت کو بطور اسم استعمال کر لیتے ہیں جیسے بڑے سخی کو الجود کہہ دیتے ہیں اور جیسے قرآن کریم میں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو کہا گیا: ﴿اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [هود: 46:11] ''کیونکہ وہ بدعمل ہے۔'' اسی طرح یہاں بِرٌّ بطور مبالغہ بڑے راستباز کو کہا گیا ہے۔

﴿عَلٰى حُبِّهٖ﴾ میں ضمیر عموماً مال کی طرف لی گئی ہے اور گو یہ سچ ہے کہ حقیقی ایثار یہی ہے کہ جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔ جیسے فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [آل عمران: 92:3] ''تم راستبازی کو ہرگز حاصل نہ کرو گے یہاں تک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔'' مگر یہاں یہ ضمیر اللہ کی طرف بھی جا سکتی ہے جیسے دوسری جگہ ﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝﴾ [الدهر: 8:76] ''اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔'' فرما کر ﴿عَلٰى حُبِّهٖ﴾ کی تفسیر اس سے اگلی آیت میں خود ہی یوں کر دی ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ [الدهر: 9:76] ''ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔'' پس دونوں جگہ عَلٰى حُبِّهٖ سے مراد اللہ کی محبت کے لیے ہیں۔ گویا یہ بتایا کہ خدا پر ایمان یہ ہے کہ اس کی محبت کے لیے اس کی مخلوق کی خدمت میں مشغول ہو جائے اور اپنے مال کو دوسروں کے لیے خرچ کرے۔ اس لیے کہ وہ بھی اسی خدا کی مخلوق ہیں جس نے اس کو دیا ہے۔

﴿ابْنَ السَّبِيْلِ﴾ اِبْنَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 61]۔ اور سبیل کے لیے [نمبر: 193]، اِبْنَ السَّبِيْلِ مسافر کو کہتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مقتولوں کے بارے میں تم پر

﴿سَائِلِيْنَ﴾۔ سوال کسی چیز کے جاننے کی استدعا ہے یا مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو معرفت یا مال کی طرف پہنچا دے۔ (غ) اور کسی شے کی معرفت کا سوال بعض وقت اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ ایک بات کا علم لیا جائے اور بعض وقت اس لیے کہ دوسرے کو ملزم کر کے خاموش کیا جائے۔ (غ) اور اللہ تعالیٰ کا سوال بندوں سے کرنا اسی دوسری غرض سے ہے اور قرآن شریف میں اکثر استعمال لفظ سؤال کا معرفت کی استدعا پر ہی ہے جیسے: يَسْئَلُوْنَكَ۔

﴿سَاَلَ سَآئِلٌ﴾ سَئَلَهُمْ۔ يَسْئَلُوْنَ وغیرہ اور سائل فقیر کو بھی کہتے ہیں۔ (غ) یہاں سائلین سے مراد دونوں قسم کے سوال کرنے والے ہو سکتے ہیں۔

﴿الرِّقَابِ﴾۔ رَقَبَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی گردن ہیں مگر اس سے مراد کل بھی لے لیا جاتا ہے اور تعارف میں مملوک یعنی غلاموں اور لونڈیوں کو رقاب کہا جاتا ہے۔ جیسے رَأْسٌ بمعنی سر اور ظَهْرٌ بمعنی پیٹھ پر، سواری پر بولا جاتا ہے: ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ [النسآء: 92:4] ''تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہئے۔'' اور یہاں جو ﴿فِي الرِّقَابِ﴾ فرمایا تو اس لیے کہ وہ مال ان کو نہیں دیا جاتا بلکہ ان کے آزاد کرنے کے لیے یا ان کے بارہ میں صرف کیا جاتا ہے اور چونکہ انسان کو عموماً گردن سے مارا جاتا ہے اس لیے رقب کے معنی آتے ہیں اس کی حفاظت کی جیسے: ﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً﴾ [التوبة: 10:9] ''کسی مومن کا لحاظ نہیں کرتے نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا۔'' اور اسی سے رقیب حفاظت کرنے والے کی معنی میں صفات الٰہی میں سے ہے۔

﴿الْبَاْسَآءُ﴾۔ بُؤْسٌ اور بَأْسٌ اور بَأْسَآءُ تینوں کے معنی شدت اور مکروہ ہیں یعنی سختی اور امر ناپسندیدہ۔ (غ) اور بَأْسٌ عذاب اور جنگ کی سختی کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: [كُنَّا إِذَا اشْتَدَّ الْبَأْسُ اتَّقَيْنَا بِرَسُولِ اللهِ ﷺ] (تفسیر الخازن، جلد1، صفحہ 27) اور بَأْسٌ کے معنی صرف حرب یعنی جنگ بھی ہیں اور بَأْسَآءُ کے معنی بھوک ہیں۔ (ت)

﴿الضَّرَّآءِ﴾۔ ضَرٌّ سے ہے جس کے معنی سوء حال ہیں نفس کے متعلق ہو جیسے علم و فضل کی کمی سے یا بدن میں مثلاً کسی عضو کے نہ ہونے کی وجہ سے یا ظاہری حالت میں جیسے مال و جاہ کی کمی سے۔ (غ) اور بَأْسَآءُ کے مقابلہ پر نَعْمَاءُ ہے اور ضَرَّآءُ کے مقابلہ پر سَرَّاءُ اور بَأْسَآءُ کے ساتھ ضَرَّآءُ میں بَأْسَآءُ سے مراد فقر یا بھوک ہے اور ضَرَّآءُ سے مراد بیماری یا اور تکالیف۔

﴿صَدَقُوْا﴾۔ صَدَقَ اور كَذَبَ کا اصل استعمال قول میں ہے۔ صدق یہ ہے کہ قول ضمیر کے مطابق ہو اور جس بات کی خبر دی ہے وہ بھی سچ ہو اور یہ دونوں افعال جوارح پر بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے: ﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ [الأحزاب: 23:33] ''کچھ مرد ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا جو اللہ سے عہد کیا تھا۔'' میں صَدَقُوْا کے معنی ہیں عہد کو سچا کر دکھایا ان افعال کے ذریعہ سے جو کیے۔ (ح) یہی معنی یہاں ہیں۔

تفصیلات شریعت میں ذکر اصل اصول کی طرف توجہ دلانا:

پچھلے رکوع سے تفصیلات شریعت کا ذکر شروع کیا تھا اور اسی ذکر کو آگے بھی جاری رکھا ہے۔ جیسے اس رکوع میں بھی قصاص اور

وصیت کا ذکر ہے۔ چونکہ بعض قوموں نے تفصیلات شریعت پر اس قدر زور دیا کہ اصل غرض کو جو باطنی طہارت تھی بھول گئے۔ اس لیے ان تفصیلات کے ذکر میں ایک خاص اصول سمجھا دیا اور وہ یہ کہ صرف ظاہری تفصیلات شریعت پر زور دینے سے جبکہ مغز شریعت کو مدنظر نہ رکھا جائے کوئی انسان حقیقی راستبازی کو حاصل نہیں کرسکتا۔ تفصیلات شریعت میں سب سے بڑا حکم کعبہ کی طرف منہ کرنے کا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اسلام کا ظاہری نشان قرار دے کر فرمایا کہ اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو۔ مگر بایں فرمایا کہ وہ راستبازی جس کی طرف اللہ تعالیٰ تم کو بلاتا ہے ان تفصیلات شریعت پر عمل کر لینے کا نام نہیں یہاں تک کہ ایک خاص سمت کی طرف منہ کر لینا بھی وہ نیکی نہیں۔ یہاں پھر ان معترضین کا بھی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ایک مشرکانہ فعل کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ فرمایا کہ کسی خاص سمت میں منہ کر لینا کوئی عظیم الشان نیکی بھی نہیں چہ جائیکہ اس سمت کی عبادت ہو۔ یہ آیت ان آیات قرآنی میں سے ایک ہے جنہوں نے اپنی علو مرتبت کا خراج سخت ترین دشمنوں سے بھی وصول کیا ہے۔

تکالیف میں صبر قوم کی کامیابی کا اصل گر ہے:

اس آیت میں قوم کی کامیابی کا اصل گر یہ بتایا ہے کہ وہ مشکلات کے مقابلہ کے وقت گھبرائے نہیں۔ اسی لیے اس کا خاتمہ ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾ پر کیا ہے اور حالانکہ مَنْ آمَنَ سے لے کر وَالْمُوْفُوْنَ تک رفع ہے مگر وَالصّٰبِرِیْنَ کو منصوب کر دیا ہے اور یہ نصب علی المدح ہے۔ یعنی خصوصیت سے توجہ دلانا اس کی طرف مقصود ہے کہ یہی بڑا مہتم بالشان امر ہے یعنی تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت نہ صرف انسان استقلال رکھے بلکہ قدم آگے بڑھائے اور یہی اصل مضمون اس سورت کا چلتا ہے۔

ایمان کا مفہوم:

جن امور کو یہاں راستبازی صدق اور تقویٰ کا جزو قرار دیا ہے وہ یہ ہیں۔

اول اصول صحیحہ کا قبول کرنا جن میں سے پہلے اللہ پر ایمان ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم کامل اور قدرت کاملہ پر ایمان لانے سے انسان کے اندر نیکیوں کی قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو سرچشمہ قدوسیت جانتا ہوا خود پاک ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ اللہ پر ایمان لا کر سارے اخلاق الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح ہر ایک قسم کی بری باتوں سے رکتا اور ہر ایک قسم کی نیکی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔

دوسرے آخرت پر ایمان یعنی ہر ایک عمل کی جزا و سزا کا قائل ہونا اور اس لیے اپنے ہر ایک عمل میں اپنی ذمہ داری کو مدنظر رکھنا۔

تیسرے فرشتوں پر ایمان یعنی نیکی کی تحریک کو جب دل میں پیدا ہو فوراً قبول کر لینا۔

چوتھے کتاب پر ایمان یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ہدایات انسان کی بہتری کے لیے نازل کی ہیں ان پر عمل پیرا ہونا۔

پانچویں نبیوں پر ایمان۔ یعنی جس طرح انبیاء نے ان تعلیمات پر عمل کر کے دکھایا ان کے نمونہ اور نقش قدم پر چلنا۔

دوسرا عظیم الشان اصل کامیابی کا عملی رنگ رکھتا ہے اور وہ ایثار ہے یعنی اپنے مال کا دوسرے کی بہبودی کے لیے خرچ کرنا۔ ان

الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ قصاص مقرر کیا گیا ہے[216] (قاتل) آزاد ہو تو آزاد

میں مقدم انسان کے اپنے قریبی ہیں۔ اولاد، ماں باپ، بھائی بہن اور رشتہ دار۔ پھر یتیم ہیں جن کا خبر گیر کوئی نہیں۔ اس لیے ہر ایک قوم کے فرد سے وہ ذوی القربیٰ کا ہی تعلق رکھتے ہیں۔ پھر مسکین ہیں جو خود کام کاج کرنے سے عاجز ہیں یا جن کے پاس کام کرنے کا ضروری سامان نہیں۔ پھر مسافر ہیں، پھر سائل ہیں، پھر گردنوں کا آزاد کرنا یا غلامی کی حالت میں پڑے ہوئے لوگوں کو اس حالت سے باہر نکالنا۔ غلامی کی حالت میں وہی لوگ آتے تھے جو جنگوں میں قید ہو جاتے تھے اور وہ گویا دشمن ہیں۔ **پس یہاں دشمنوں سے پیار** اور محبت کی نری منہ سے تعلیم نہیں **بلکہ عملی رنگ میں** ان سے نیکی کا حکم دیا کہ ان کی آزادی کا فکر کیا جائے۔ اس زمانہ میں تو کم ہی مسلمان ہیں جن کی گردنیں آزاد ہیں اور جو غلامی کی حالت میں نہیں۔ پس مسلمانوں کی بہتری پر، ان کی تعلیم پر، ان کی ترقی پر روپیہ خرچ کرنا بھی اس کے اندر آجاتا ہے۔

نماز اور زکوٰۃ:

اس کے بعد تیسرا اصل فرمایا نماز قائم کرے جو انسان کے اپنے نفس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اور زکوٰۃ دے جو دوسروں کی بہبودی کے لیے ہے۔

اس کے بعد چوتھا اصل فرمایا کہ عہد کرے تو اس **عہد کو پورا کرے** خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے اور خواہ وہ اقرار کافر سے ہو یا مسلمان سے۔ آج مہذب ممالک میں اقرار کی پابندی اس وقت تک ضروری سمجھی جاتی ہے جب تک اپنا مطلب نکلتا ہو اور بس۔ اور آخر میں پانچواں اور سب سے **ضروری اصل** بیان کیا ہے اور وہ ہے **صبر**۔ تنگی میں جب فقر و فاقہ اٹھانا پڑے، دکھ درد اور تکلیف کی حالت میں جب انسان کو جسمانی طور پر دکھ پہنچ رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر حِيْنَ الْبَاْسِ مشکلات سے مقابلہ کے وقت میں یا دشمن سے مقابلہ کے وقت میں، جیسے جنگ کی حالت میں۔ **یہی اصل گر کامیابی کا ہے**۔ اسی لیے اس کو آخر پر رکھا اور منصوب علی المدح کیا۔ جن قوموں میں پہلی چار چیزیں نہیں وہ بھی صبر سے کامیاب ہو جاتے ہیں مگر حقیقی نیکی اور راستبازی ان کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

آخر پر فرمایا کہ دعویٰ ایمان میں یہی لوگ سچے ہیں اور متقی بھی یہی ہیں۔

216- ﴿كُتِبَ﴾۔ كِتَابٌ کے معنی کے لیے دیکھو نمبر 9۔ مگر کتابۃ کے معنی اثبات یعنی ایک چیز کا قائم کرنا اور تقدیر یعنی اندازہ کرنا اور ایجاب یعنی واجب کرنا اور فرض کر دینا اور عزم بھی آتے ہیں۔ کیونکہ پہلے ایک چیز کا ارادہ کیا جاتا ہے پھر کہی جاتی ہے پھر لکھی جاتی ہے۔ گویا اس کا مبدأ ارادہ ہے اور اس کا منتہا لکھنا۔ (غ) اس لیے مقرر کرنے یا فرض کرنے کے معنی میں کثرت سے یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے جیسے یہاں اور [آیت: 180] میں ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ﴾ ''تم پر جب تم میں سے کسی کے لیے موت آموجود ہو، وصیت کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے اگر وہ بہت سا مال چھوڑیں۔'' اور [آیت: 183] میں ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ ''تمہارے لیے روزے ضروری ٹھہرائے گئے ہیں۔'' اور [آیت: 187] میں ﴿وَابْتَغُوْا مَا

الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ

(ہی مارا جائے) اور غلام ہو تو غلام اور عورت ہو تو عورت،(217) مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اور جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے چاہو۔'' اور [آیت: 216] میں ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ ''تم پر جنگ کرنی لکھی گئی ہے۔'' اور بہت سے دیگر مقامات پر اور اسی لیے کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم بھی ہوتا ہے جیسے: ﴿اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [الأنفال: 75:8] ''رشتہ کے تعلقات والے اللہ کے حکم میں آپس میں زیادہ حق دار ہیں۔'' میں کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم ہے۔ (غ)

﴿قِصَاصٌ﴾۔ قَصَّ سے ہے جس کے معنی نقش قدم کے پیچھے چلنا ہے۔ ﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ [الكهف: 64:18] ''سو وہ دونوں اپنے (پاؤں کے) نشانوں کا پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے۔''، ﴿وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ﴾ [القصص: 11:28] ''اور (موسیٰ کی ماں نے) اس کی بہن سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے جا۔'' اسی سے قصص اخبار بیان کرنے کے معنی میں ہے ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ [یوسف: 3:12] ''ہم اس قرآن سے تجھے نہایت اچھا بیان سناتے ہیں۔'' اور قصاص کے معنی ہیں [تَتَبُّعُ الدَّمِ بِالقَوَدِ] (غ) یعنی خون کا پیچھا کرنا اس طرح پر کہ قاتل کو قتل کیا جائے اور حدیث میں ہے: [مَنْ قَتَلَ عَمْدًا فَهُوَ قَوَدٌ] (سنن أبي داؤد، كتاب الديات، باب مَنْ قُتِلَ فِي عِمِّيَّاءَ بَيْنَ قَوْمٍ: 4541؛ سنن ابن ماجه، كتاب الديات، باب مَنْ حَالَ بَيْنَ وَلِيِّ الْمَقْتُولِ وَبَيْنَ الْقَوَدِ أَوِ الدِّيَةِ: 2635؛ صحيح) جس کے معنی ہیں کہ جو شخص عمداً قتل کرے اس کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے۔ (ل۔ قَوَدٌ) پس ﴿الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ یہ ہے کہ جس شخص نے کسی دوسرے کو قتل کیا ہے اسے قتل کیا جائے۔ قصاص کے اس معنی کو مدنظر رکھ کر اگلے الفاظ کے معنی میں کوئی دقت نہیں رہتی۔

اس آیت میں مقتول کے بارہ میں **قصاص کا حکم** دیا ہے یعنی قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا ذکر یہاں اس **مناسبت سے کیا ہے** کہ مسلمانوں کے اب اپنے دکھ دینے والوں اور قتل کرنے والوں سے قصاص لینے کا وقت آ گیا تھا۔ قرآن کریم میں قصاص کا حکم صرف قتل کی صورت میں ہے۔ **زخموں میں قصاص** کا حکم نہیں۔ صحابہ نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کر لیا ہو تو ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوری: 40:42] ''بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔'' کے ماتحت ہے۔ اور اسی کے ماتحت ایک بدی کے مناسب حال اور سزا دی جا سکتی ہے۔ مگر قتل میں صراحت سے قصاص کا حکم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں قاتل کے لیے قتل کی سزا کو ہی ضروری قرار دیا ہے۔ اس سزا کو دنیا سے اٹھانے کی جتنی کوششیں کی گئیں ہیں سب ناکام ہوئی ہیں۔ فرانس میں کچھ عرصہ کے لیے سزائے موت موقوف کی گئی تھی جس کا نتیجہ جرائم قتل میں خطرناک اضافہ ہوا۔ پس یہ بتایا ہے کہ قتل میں قصاص تمدن و تہذیب کی ضروریات میں سے ہے۔

217- جب اوپر قصاص کا حکم صاف الفاظ میں بیان کر دیا یعنی یہ کہ قتل کا حکم قاتل پر ہے نہ کسی دوسرے پر۔ تو یہاں ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں ایک رسم قبیح کی بیخ کنی مقصود تھی۔ عرب میں رواج تھا کہ بعض قومیں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا

بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیے اور نیکی کے ساتھ اُسے ادا کیا جائے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے، پھر جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔[218]

وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو تاکہ تم بچے رہو۔[219]

سمجھتی تھیں اس لیے ان کا غلام قتل ہو جائے تو وہ کہتے تھے کہ ہم اس کی جگہ آزاد کو قتل کریں گے۔ ایسا ہی یہ بھی رواج تھا کہ آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس آزاد کو قتل نہ کیا جاتا تھا۔ ایسا ہی اب بھی رواج ہے کہ بعض قومیں جو اپنے آپ کو زیادہ مہذب خیال کرتی ہیں ان کا کوئی آدمی کسی ماتحت قوم کے آدمی کو قتل کر دے تو وہ اس سے قصاص نہیں لیتیں۔ پس جب اسلام نے قصاص کا حکم دیا یعنی یہ کہ قاتل کو قتل کیا جائے تو ساتھ ہی تمام امتیازات کو بھی اٹھا دیا اور فرمایا کہ قاتل آزاد ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ عورت قاتل ہو تو وہی قتل کی جائے، غلام قاتل ہو تو وہی قتل کیا جائے اور سارے امتیازات قومی و امتیازات مرتبہ کو اٹھا دیا۔ چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے: [الْمُسْلِمُونَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ] (سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب فِي السَّرِيَّةِ تَرُدُّ عَلَى أَهْلِ الْعَسْكَرِ: 2753) سب مسلمانوں کے خون برابر ہیں اور قاتل خواہ کوئی ہو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس کا خون مقتول سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں آزاد غلام کو قتل کر دے تو آزاد قتل کیا جائے گا اور یہی قرآن شریف کا مذہب ہے۔

218- **خون بہا:** اس حصہ میں یہ اجازت دی ہے کہ اگر مستغیث یعنی وارث مقتول خون بہا پر راضی ہو جائے تو دیت کا لے لینا جائز ہے۔ اس زمانہ میں بھی بعض حالات میں خون بہا لے لینا جائز ہے۔ جیسے ایک سلطنت کا باشندہ دوسری سلطنت کی کسی رعایا کو خاص حالات میں قتل کر دے تو ہرجانہ ہی کافی معاوضہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس لیے ہر قسم کی گنجائش اس کی تعلیم میں موجود ہے۔

219- **قصاص قوم کی زندگی کی بنیاد ہے:** اگر دنیا میں قتل کی سزا قتل نہ ہوتی تو کسی قوم کے لیے بھی امن کی زندگی نہ ہوتی۔ جن قوموں نے قتل میں قصاص کو اڑانے کی کوشش کی ہے دنوں میں قتل کے واقعات ان میں اس قدر بڑھے ہیں کہ مجبوراً پھر اسی سزا کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں جب تم کو تلوار سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اب قصاص لیے بغیر تم بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

تم پر جب تم میں سے کسی کے لیے موت آموجود ہو عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے اگر وہ بہت سا مال ماں باپ کے لیے اور قریبیوں کے لیے چھوڑے یہ متقیوں پر لازم ہے۔ (220)

220- ﴿خَيْرٌ﴾ کے معنی لغت میں اور صحابہ سے مال کثیر مروی ہیں۔ چنانچہ مفردات میں ہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ مال کو خیر نہیں کہا جاتا جب تک کہ وہ کثیر نہ ہو اور مکان طیب سے نہ ہو۔

حکم وصیت منسوخ نہیں:

یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جن پر منسوخی کا حکم قطعی سمجھا جاتا ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ پہلے وصیت کا حکم دیا گیا پھر سورہ نساء میں وراثت کا حکم نازل کر کے اسے منسوخ کیا گیا ہے۔ مگر اس کے متعلق غیر منسوخ ہونے کے اقوال بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ ایک جماعت نے قائلین منسوخی کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے اسے غیر منسوخ قرار دیا ہے۔ بیضاوی میں بھی اس کے منسوخ نہ ہونے کا قول موجود ہے۔

قرآن وحدیث کی شہادت:

حق یہ ہے کہ اس کے غیر منسوخ ہونے کی قرآن شریف اور حدیث صحیح سے کھلی کھلی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف سے تو یوں تائید ہوتی ہے کہ وراثت کے حکم میں ہر جگہ ساتھ ساتھ ﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ﴾ کا لفظ موجود ہے یعنی تقسیم ترکہ وصیت کے نفاذ کے بعد ہو۔ پس وہ وصیت اور کون سی ہے اگر یہ منسوخ ہے؟ اور دوسرے سورہ مائدہ میں جو آخری سورتوں میں سے ایک ہے صاف طور پر وصیت لکھا جانے اور اس پر عمل درآمد کرنے، گواہی لینے وغیرہ کا حکم موجود ہے۔ دیکھو [المآئدۃ: 107,106]

حدیث سے اس کا غیر منسوخ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے متفق علیہ حدیث ہے کہ میں فتح مکہ کے سال بیمار ہو گیا (یعنی آیت وراثت کے نزول کے مدت بعد) رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ تو میں نے کہا یا رسول اللہ! میرے پاس بہت سا مال ہے اور ایک ہی بیٹی میری وارث ہے میں سب مال کی وصیت کر دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر میں نے دو تہائی کے لیے عرض کی۔ پھر نصف کے لیے آپ نے انکار ہی کیا۔ پھر میں نے ایک تہائی کے لیے عرض کیا تو آپ نے ایک تہائی کی وصیت کرنے کو قبول کیا اور فرمایا اگر تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑو تو اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو غریب چھوڑو۔ اس حدیث سے جو نبی کریم ﷺ کی زندگی کے آخری ایام کی ہے صاف ظاہر ہے کہ حکم وصیت اس وقت تک غیر منسوخ سمجھا جاتا تھا اور نہ صرف ایک صحابی نے ہی اسے غیر منسوخ سمجھا بلکہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی اسے غیر منسوخ قرار دیا اور وصیت کرنے کو جائز رکھا۔ ہاں نبی کریم ﷺ نے یہ ضروری قرار دیا کہ ورثا کو بالکل محروم نہ کیا جائے۔ اس لیے ایک

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

پھر جو کوئی اس کے بعد جو اس نے سن لیا ہے اسے بدل دے تو اُس کا گناہ اُنہی پر ہے جو اسے بدلتے ہیں اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

تہائی تک مال کی وصیت کر دی جائے۔ دوسرے اس سے معلوم ہوا کہ اس وصیت سے مراد خیراتی کاموں کے لیے وصیت ہے نہ رشتہ داروں اور قریبیوں کے لیے۔ اسی لیے میں نے آیت کے معنی کرنے میں یہ ترکیب اختیار کی ہے کہ ﴿لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ کا تعلق ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرَا﴾ سے ہے یعنی جو شخص مال کثیر ماں باپ اور قریبیوں کے لیے چھوڑے وہ وصیت کرے۔ ماں باپ اور قریبیوں کے لیے وصیت کرنا مراد نہیں۔ تیسرے معلوم ہوا کہ خیر سے مراد آنحضرت ﷺ کے سامنے بھی مال کثیر ہی لیا گیا کیونکہ خود حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ میرا مال کثیر ہے اور اسی بنا پر وصیت کی اجازت چاہی۔

ورثا کے لیے وصیت نہیں:

پس حدیث متفق علیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے معنی یوں سمجھتے جاتے تھے اور خود آنحضرت ﷺ نے یہی لیے کہ جب ایک شخص کا ترکہ بہت سا ہو تو وہ کچھ حصہ کی وصیت خدا کی راہ میں کر دیا کرے۔ ورثا کے لیے وصیت کی ضرورت تو اس لیے بھی نہیں کہ ان کے حصے خود قرآن شریف نے مقرر کر دیئے اور حدیث [لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ] (صحيح البخاري، الوصايا، بَابٌ لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ) گو احاد میں سے ہے مگر قرآن کریم کے مطابق ہے۔ ہاں بعض صورتوں میں جب اقربا کو وراثت کا حصہ نہ ملتا ہو تو وہ بھی وصیت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ دوسری روایات سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔

سیدنا علیؓ کا فیصلہ: چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان کے ایک آزاد کردہ غلام نے جس کا ترکہ سات سو درہم تھا وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اسے روک دیا۔ اور فرمایا یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے۔

سیدہ عائشہؓ کا فیصلہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی شخص نے پوچھا کہ میرے پاس تین ہزار درہم ہیں اور چار وارث ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ تھوڑی سی چیز ہے اپنے عیال کے لیے چھوڑ دو۔ یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے۔ پس ایک حدیث متفق علیہ میں رسول اللہ ﷺ کا اپنا فیصلہ دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فیصلہ جن کا فہم قرآن مسلم امر ہے۔ اس آیت کے معنی کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں اور اسے غیر منسوخ قرار دیتے ہیں اور مراد اس سے صرف اسی قدر ہے کہ جو شخص اپنے ورثا کے لیے مال کثیر چھوڑے وہ کچھ حصہ اس مال کا فی سبیل اللہ بھی وصیت کرے۔ مسلمانوں میں آج اس پر عمل متروک ہے۔ مگر دوسری قومیں ایسی وصیتیں کرتی ہیں۔ کس قدر مصیبت ہے کہ پیروانِ قرآن قرآن پر عامل نہیں، منکرین قرآن اس پر عامل ہیں۔

اور اگر یوں بھی معنی کیے جائیں کہ اگر کوئی شخص مال کثیر چھوڑے تو اس کے لیے اپنے والدین اور قریبیوں کے لیے وصیت کرنا مقرر کیا گیا ہے تو بھی آیت کو منسوخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں وصیت پر عملدرآمد کرانے

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع 22 6 6

مگر جسے وصیت کرنے والے کی طرف سے طرفداری یا گناہ کا خوف ہو پھر وہ ان کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(221)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے روزے ضروری ٹھہرائے گئے ہیں جیسے کہ ان لوگوں کے لیے ضروری ٹھہرائے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے(222)

والے والدین اور اقربین مراد لیے جائیں۔ یا ہوسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں والدین کو ورثہ نہ ملتا ہو تو ان حالات پر یہ حاوی ہو جیسے مثلاً والدین کافر ہوں۔ اور قریبی تو بہتیرے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو حصہ نہیں پہنچتا ان کے لیے وصیت ہوسکتی ہے یا اگر کوئی اور صورت تسلیم نہ کی جائے تو حدیث [لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ] کو آیت کے مقابلہ میں منسوخ قرار دیا جائے گا۔

221- جَنَفٌ حکم یعنی فیصلہ کرنے میں ایک طرف جھک جانے کا نام ہے۔ حق سے باطل کی طرف جھکنا۔ (غ)

وصیت کے وقت اصلاح:

اِثْمٌ سے مراد عمداً خلاف ورزی حکم الٰہی ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وصیت کرنے والا کسی وارث کے حق کو تلف کر رہا ہو یا خلاف ورزی حکم الٰہی میں کوئی مال وصیت کرنے لگے تو دوسروں کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کر دیں۔ جیسا کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

222- ﴿اَلصِّيَامُ﴾۔ صَوْمٌ۔ اصل میں ایک فعل سے رکنے کا نام ہے۔ کھانا ہو یا کلام یا چلنا۔ ﴿اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾ [مریم: 26:19] ''میں نے رحمٰن کے لیے (اپنے اوپر) روزہ واجب کیا ہے۔'' کلام سے رکنے کو صوم کہا ہے جیسے: ﴿فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا﴾ [مریم: 26:19] ''اس لیے آج میں کسی انسان سے کلام نہیں کروں گی۔'' سے خود ظاہر ہے۔ اصطلاح شریعت میں اس شخص کا جو احکام شریعت کا مکلف ہو چکا ہے صبح کی سفیدی کے نمودار ہونے سے رات کی سیاہی کے نمودار ہونے (یعنی غروب آفتاب) تک ارادۃً کھانا کھانے، پانی پینے اور جماع سے رکا رہنا ہے۔ (غ) اور اس کے ساتھ جیسا کہ احادیث نے وضاحت کر دی ہے ہر ایک لغو یا ناجائز فعل یا قول کا ترک بھی شامل ہے۔

روزہ کا دنیا کی سب قوموں میں پایا جانا:

جس کی طرف یہاں قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے ایک حقیقت ہے اور دنیا کی کوئی قوم نہیں جس نے روزہ کو عبادات میں نہ رکھا ہو۔ صرف عیسائیوں نے شریعت کو جواب دے کر روزوں کا انکار کیا ہے۔ گو اب ان کے حکما بھی کسی نہ کسی رنگ میں روزہ کی

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ تاکہ تم متقی بنو۔(223)

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا چند دن،(224) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو

ضرورت کے گو جسمانی فوائد کی خاطر ہی سہی قائل ہو رہے ہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ **حضرت عیسیٰؑ کا اناجیل سے نہ صرف خود روزے رکھنا ثابت ہے بلکہ اپنے پیروؤں کے لیے روزے رکھنے کی تعلیم موجود ہے** اور عیسائیت کا موجودہ خیال کہ شریعت پر عمل کرنے کا فائدہ نہیں، پولوس کا خیال ہے۔[متی: 2:4] سے مسیح کا روزہ رکھنا ثابت ہے: ''اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہوا۔'' اور[متی: 16:6] میں ہے: ''کہ جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ۔'' اور[متی: 15:6] میں روزہ کے ثواب کا ذکر ہے: ''اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے۔'' اگر عبادت پر ثواب ملتا ہے اور مسیح کی تعلیم بھی یہی ہے تو کفارہ کا عقیدہ باطل ہے اور[لوقا: 5:33-35] سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح نے کہا تھا کہ ان کے شاگردان کے بعد بہت روزے رکھیں گے۔ ''پر وَے دن آویں گے کہ دولہا ان سے جدا کیا جائے گا اور ان دنوں میں وَے البتہ روزہ رکھیں گے۔''

223- یہ روزہ کی علت غائی ہے۔ پہلی قوموں میں جو روزہ رکھنے کا رواج تھا وہ جیسا کہ پادری کروڈن نے نجوم بائبل میں لکھا ہے غم اور رنج اور مصیبت کے وقت تھا۔ گویا ظاہر صورت میں غم اور مصیبت اختیار کی جاتی تھی۔ اسلام نے روزہ کی غرض یہ بیان کی ہے کہ تم متقی بنو۔ یعنی تمہارے اندر بدی کی طاقتیں کمزور اور نابود ہوں اور نیکی کی قوتیں نشوونما پائیں۔ کیونکہ انسان کی ہر ایک قوت اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ اسے نشوونما دی جائے اور روزہ میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری کے لیے حلال چیزوں کو ترک کیا جاتا ہے۔ پس روزہ سے خواہشات کو ترک کرنے کی قوت انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور یہی قوت انسان کو اپنے نفس پر حاکم بنا کر اعلیٰ سے اعلیٰ پاکیزگی اور نیکی کے مقام پر پہنچاتی ہے۔ اسلام نے ہر ایک چیز کو ایک قاعدہ اور ضبط کے ماتحت کیا ہے اور وقت پر کھانا عین تعلیم اسلامی کے مطابق ہے۔ روزہ میں اس ضبط کو توڑنا مقصود نہیں بلکہ انسان کے اندر یہ قوت پیدا کرنا مقصود ہے کہ خواہشات حیوانی جو کھانے پینے اور زوج کی طرف رجوع کرنے سے تعلق رکھتی ہیں انسان کے اقتدار کے نیچے ہوں اور ایسا نہ ہو کہ انسان ان کا غلام اور محکوم بن جائے۔ روزہ میں خواہشات حیوانی پر قابو پانے کی عملی راہ بتائی ہے۔ پس اسلام دوسرے مذاہب سے یہ امتیاز رکھتا ہے کہ روزہ کو انسان کی زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

224- ﴿مَعْدُوْدَات﴾۔[آیت: 80] میں اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً آیا ہے۔ عَدَّ کے معنی اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا یا گنتی کرنا ہے۔ ﴿وَعَدَّهُمْ عَدًّا﴾[مریم: 94:19] ''اور انہیں پورا پورا گن رکھا ہے۔''، ﴿فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ﴾[المؤمنون: 113:23] ''سو گنتی رکھنے والوں سے پوچھئے۔'' یعنی گننے والے یا حساب رکھنے والے۔ ﴿اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾[السجدة: 5:32] ''ہزار سال ہے اس سے جو تم گنتے ہو۔'' اور پھر محض گنتی سے تجاوز کر کے کئی طرح پر عَدَّ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کسی چیز کو معدود کہا جاتا ہے جب قلت ظاہر کرنا مقصود ہو اور اس صورت میں اس کا مقابلہ اس سے ہوتا ہے جو اپنی کثرت کی وجہ سے گنتی میں نہیں لائی جا سکتی۔ (غ)

اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَى تو اور دنوں سے گنتی (پوری) کی جائے[225] اور جو اس

اور یہی یہاں مراد ہے۔ چنانچہ مقاتل کہتے ہیں کہ معدود یا معدودات کا لفظ جہاں جہاں قرآن شریف میں آیا ہے تو اس سے مراد چالیس سے کم ہے۔ (ر) خواہ چالیس ہوں جیسے [آیت: 80] میں یا تیس جیسے یہاں آگے شہر رمضان کہہ کر بتا بھی دیا ہے یا تین جیسے: ﴿وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ [البقرة: 203:2] ''اور گنتی کے دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔'' میں اور آگے آتا ہے ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرة: 184:2] ''تو اور دنوں سے گنتی (پوری) کی جائے۔'' اور ﴿لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ [البقرة: 185:2] ''اور کہ تم گنتی کو پورا کرو۔'' تو عِدَّةٌ کے معنی اَلشَّيْءُ الْمَعْدُوْدُ ہیں یا گنی گئی چیز اور محض گننا بھی جیسے ﴿وَ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ﴾ [المدثر: 31:74] ''اور ہم نے ان کی گنتی صرف۔'' اور عورت کی عدت وہ دن ہیں جن کے گزرنے پر اس کا نکاح کرنا جائز ہے۔ (غ)

یہاں ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ سے مراد رمضان کا مہینہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ عاشورہ کا روزہ یا بعض اور روزے جو نبی کریم ﷺ اس حکم کے آنے سے پہلے رکھتے تھے وہ محض نفل کے طور پر تھے نہ وحی الٰہی کے حکم سے اور اس لیے ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ میں ان کی طرف اشارہ نہیں۔ چنانچہ ابن جریر نے دونوں قسم کے اقوال نقل کر کے لکھا ہے کہ میرے نزدیک درست قول اسی شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ سے اشارہ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ کی طرف ہے کیونکہ کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے حجت قائم ہو سکے کہ کبھی اہل اسلام پر کوئی روزے سوائے رمضان کے فرض کیے گئے ہوں اور پھر وہ رمضان کے روزوں سے منسوخ ہو گئے ہوں۔ (ج) اور بخاری میں جو عاشورہ کا روزہ رکھنے کا حکم ہے تو یہ یا نزول آیت سے پہلے تھا یا صرف بطور نفل۔

225- ﴿مَرْضٰى﴾۔ مَرِيْضٌ کی جمع ہے اور مرض اس اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے اور یہ جسم میں بھی ہو سکتی ہے اور اخلاق میں جہل، بخل، نفاق، بزدلی وغیرہ کو بھی مرض کہا جاتا ہے۔ (غ) اور مرض کے اصل معنی نقصان ہیں اس لیے اَرْضٌ مَرِيْضَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جو کمزور ہو۔ اسی طرح شَمْسٌ مَرِيْضَةٌ جب سورج پوری روشنی نہ دے۔ (ت)

﴿سَفَرٍ﴾۔ سَفَرٌ کے اصل معنی كَشْفُ الْغِطَاءِ ہیں یعنی پردہ کا اٹھا دینا۔ (غ) اسی لیے سَافِرٌ لکھنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک چیز کو کھول دیتا ہے اور واضح کر دیتا ہے۔ اس کی جمع سَفَرَةٌ ہے ﴿بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ﴾ [عبس: 15:80] ''لکھنے والوں کے ہاتھوں میں۔'' (ن) اور سِفْرٌ کتاب کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حقائق کا انکشاف کرتی ہے۔ اس کی جمع اَسْفَارٌ ہے ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعة: 5:62] ''گدھے کی مثال کی طرح ہے (جو) کتابیں اٹھاتا ہے۔'' (غ) اور حدیث میں [أَسْفِرُوا بِالْفَجْرِ] (جامع الترمذي، كتاب الصلاة، باب مَا جَاءَ فِي الإِسْفَارِ بِالْفَجْرِ: 154؛ صحيح) آتا ہے یعنی ''فجر کو اچھی طرح روشن ہو جانے دو۔'' (ن) اور مسافر کو مسافر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مکان سے الگ ہو گیا اور مکان اس سے۔ (غ) پس سفر مکان سے دور ہو جانے کا نام ہے۔

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ میں مشقت پاتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ
مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ دیں۔(226) پھر جو کوئی تکلیف سے نیکی کرتا ہے وہ

روزہ چھوڑنے کے لیے بیماری کی حد:

بیماری کیسی ہو اس میں افراط وتفریط دونوں سے بچنا چاہیے۔ یہ کہنا کہ مرض ایسا خطرناک ہو کہ انسان کے فوراً مرجانے کا خطرہ ہو یا یہ کہ ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف ہو تو روزہ ترک کر دیا جائے۔ دونوں غلط رائے ہیں۔ اگر روزے رکھنے سے دوائی نہ پینا یا بار بار ہلکی غذا کا نہ پہنچنا یا اور کوئی وجہ بیماری کے بڑھانے کا موجب ہو تو روزہ ترک کرنا چاہیے۔ ہاں بخاری میں عطاء کا قول ہے: [يُفْطِرُ مِنَ الْمَرَضِ كُلِّهِ] (صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: أياما معدودات ...) یعنی ہر ایک بیماری میں روزہ چھوڑ دے۔ مگر اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شکایت پر روزہ چھوڑ دے۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ شکایت تو ہر ایک انسان کو رہتی ہے۔

سفر کس قدر ہو؟

بعض نے کہا لفظ عام ہے خواہ کسی قدر ہو۔ بعض نے ایک دن رات اس کی حد قرار دی ہے۔ امام شافعی نے 16 فرسخ اور امام ابوحنیفہ نے تین منزل یعنی تین دن کا سفر یا 24 فرسخ۔ قول اول قرآن کریم کے عام الفاظ پر مبنی ہے۔ امام شافعی نے ایک حدیث پر بنیاد رکھی ہے جس میں آتا ہے کہ چار برد سے کم میں قصر صلوٰۃ نہ کرو۔ اور برید بعض کے نزدیک چار فرسخ اور بعض کے نزدیک دو فرسخ ہے۔ پس 24 میل یا 48 میل کی حد اس حدیث کی رو سے ہوئی۔ مگر قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے قول اول کو ہی ترجیح ہے کیونکہ بعض وقت 24 میل سے کم سفر میں بھی روزہ چھوڑنا ضروری ہو سکتا ہے۔ ہاں سیر اور سفر میں ہر شخص فرق کر سکتا ہے۔ پھر سفر خواہ پیدل ہو خواہ کشتی پر خواہ گھوڑے پر خواہ ریل پر سفر ہی ہے۔ ان چیزوں سے سفر کے سفر ہونے کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

سفر اور بیماری میں روزہ ترک کرنے کی رخصت ہے یا وجوب:

اس پر بہت بحث ہوئی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ سفر میں روزہ ترک کرنا ضروری سمجھتے تھے اور بعض اگر قابل برداشت پاتے تو رکھ بھی لیتے تھے۔ لیکن اگر رخصت بھی اسے تصور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رخصتیں فائدہ اٹھانے کے لیے ہی ہیں اور محتاط مذہب یہی ہے کہ سفر اور بیماری میں روزہ نہ رکھا جائے۔ لیکن بایں اگر کوئی شخص رکھ لے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے گناہ کیا ہے یا یہ کہ اس کا روزہ نہیں ہوا۔

226- ﴿يُطِيْقُوْنَ﴾۔ طَاقَةٌ کے معنی میں مفردات میں ہے: [وَالطَّاقَةُ اِسْمٌ لِمِقْدَارِ مَا يُمْكِنُ لِلْاِنْسَانِ أَنْ يَّفْعَلَهُ بِمُشَقَّةٍ] یعنی طاقت اس مقدار کا نام ہے جو انسان کے لیے ممکن ہے کہ اس کو مشقت کے ساتھ کر سکے۔ کیونکہ یہ لفظ طوق سے مشتق ہے اور طوق وہ چیز ہے جو گردن میں ہو یعنی اس کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ اسی تشبیہ کے لحاظ سے طَاقَةٌ کے یہ معنی ہیں۔

لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ اس کے لیے بہتر ہے۔اور روزے رکھنا تمہارے لیے

(غ) اس لیے يُطِيْقُوْنَهٗ کے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ جن کو روزہ رکھنے میں سخت مشقت اٹھانی پڑے۔ اور تفسیروں میں ایک قول اس کے مطابق ہے۔ [يَصُوْمُوْنَهٗ جُهْدَهُمْ وَطَاقَتَهُمْ] (تفسير البيضاوی، جلد1، صفحہ 461) اور دوسری قراءتیں جیسے يُطَيِّقُوْنَهٗ يا يُطَوِّقُوْنَهٗ اس معنی کی مؤید ہیں کیونکہ اول کے معنی يَتَكَلَّفُوْنَهٗ ہیں اور دوم کے معنی بھی یہی ہیں یعنی يُكَلِّفُوْنَهٗ يا يُقَلِّدُوْنَهٗ ہیں جو طوق سے ہے اور مراد ہر صورت میں یہی ہے کہ ان کے لیے روزہ رکھنے میں سخت مشقت یا تکلیف ہے اور يُطِيْقُوْنَهٗ کے معنی يَتَجَشَّمُوْنَه عبداللہ سے مروی ہیں۔ (ث) یعنی تکلیف سے روزہ رکھ سکتے ہوں۔

فِدْيَةٌ۔ فَدٰی اور فِدَآءٌ کے معنی ہیں انسان کا کسی مصیبت سے اپنی حفاظت کر لینا اس مال کے ذریعہ سے جو اس کے لیے خرچ کرے۔ (غ)

آیت فدیہ صیام کی منسوخی میں اختلاف:

بخاری میں ایک روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب یہ نازل ہوئی تو جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا فدیہ دے دیتا۔ اور بخاری میں ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ اس سے مراد بہت بوڑھے ہیں۔ تو اختلاف کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ جو بزرگ اس آیت کے معنی کو دوسری آیت کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکے انہوں نے اسے منسوخ کہہ دیا اور جن کے نزدیک تطبیق ہو گئی انہوں نے کہا غیر منسوخ ہے اور جب معنی میں تطبیق ہو سکتی ہے تو آیت کو منسوخ کہنا بے معنی ہے۔

روزہ کا فدیہ کون لوگ دے سکتے ہیں:

ظاہر ہے کہ يُطِيْقُوْنَهٗ میں ضمیر اسی کی طرف ہی جا سکتی ہے جس کا ذکر پہلے چلا آتا ہے نہ فدیہ یا طعام کی طرف جس کا ذکر ابھی نہیں آیا۔ پس یہ معنی کرنا ٹھیک نہیں کہ جو فدیہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دے دیا کریں۔ اور نہ یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں اور پھر روزہ نہیں رکھتے وہ فدیہ دے دیا کریں۔ کیونکہ یہ لفظ قرآن شریف میں نہیں۔ وہاں يُطِيْقُوْنَ ہے جس کے اس معنی پر جس کی تائید دوسری قراءتوں سے ہوتی ہے غور نہیں کیا گیا۔ پس اصل معنی یوں ہوں گے کہ جو اس کو مشقت کے ساتھ کر سکتے ہیں وہ فدیہ دے دیا کریں۔ اوپر ساتھ ہی ذکر بیمار اور مسافر کا ہے۔ پس صاف اور واضح منشا الفاظ قرآنی کا یہ ہے کہ بیمار اور مسافر پیچھے گنتی پوری کر لیا کریں؛ لیکن وہ جن کو پیچھے گنتی پورا کرنے میں مشقت ہے وہ فدیہ دے دیا کریں۔ ظاہر ہے کہ بعض لوگ اپنی عمر کا بڑا حصہ سفر میں ہی گزار دیتے ہیں اور بعض لوگ دائم المریض ہوتے ہیں اور اسی حکم میں بہت بوڑھے لوگ بھی ہیں کیونکہ بڑھاپا بھی حالت اعتدال سے انسان کو نکال دیتا ہے۔ اور ابوداؤد کی حدیث کی رو سے اسی حکم میں حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ہیں۔ کیونکہ اس میں حمل یا بچہ کے ضائع ہونے کا خوف ہوگا اور وہ بھی حالت اعتدال میں نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ دے دیا کریں۔ پس اصل بات یہ ہے کہ یہ حکم صرف مریض اور مسافر کے لیے

تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ بہتر ہے اگر تم جانو۔[227]

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت، اور ہدایت کی۔ اور حق اور باطل کو الگ کر دینے کی کھلی دلیلیں ہیں۔[228] پس جو کوئی تم میں سے اس مہینے

ہے جن کو رمضان کے روزوں کی جگہ پچھلے دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب ان کی حالت ایسی ہو کہ وہ پچھلے دنوں میں بھی تعمیل حکم میں مشقت پاتے ہوں تو ﴿فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ﴾ دے دیا کریں۔ اور حدیث نے یہ بتا دیا کہ بوڑھے مرد اور عورتیں بھی مریض کے حکم میں ہی داخل ہیں۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو روزہ کی بجائے فدیہ دے دیا کرتے تھے۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان الفاظ کو منسوخ صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ شہر رمضان والی آیت میں یہ دہرائے نہیں گئے۔ حالانکہ یہ محض ایک رخصت کا رنگ ہے اور ضروری نہیں کہ اس کو بار بار دہرایا جاتا۔ محض دوبارہ یہ لفظ نہ آنے سے ان کو منسوخ سمجھنا بالکل غلط استدلال ہے۔

اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں اور یہ فدیہ صدقہ فطر کی صورت میں بروئے حدیث ضروری ہے اور یہ معنی بھی اس آیت کو دوسری آیات کے خلاف نہیں رہنے دیتے اور یہاں ذکر بھی ایک مسکین کے کھانے کا ہے۔

227- ﴿تَطَوَّعَ﴾۔ تَطَوُّعٌ کے معنی گو عام طور پر شوق سے یا نفل کے طور پر نیکی کرنا ہے مگر اس کے اصلی معنی تَكَلَّفَ الطَّاعَةَ ہیں۔ (غ) یعنی طاعت بطور تکلف اختیار کرنا اور یہی معنی یہاں مراد ہیں اور بطور نفل نیکی اختیار کرنا خود اسی سے ماخوذ ہے۔

یہاں روزے کی علت غائی کی طرف پھر توجہ دلائی ہے کیونکہ روزہ رکھنا بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا ہے اس لیے فرمایا کہ بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس لیے **اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے نیکی کی قوت ترقی پکڑتی ہے** اور اگر شوق سے نیکی اختیار کرنا معنی لیے جائیں تو مراد یہ ہو سکتی ہے کہ زیادہ مسکینوں کو کھانا دے دے۔

228- ﴿شَهْرُ﴾۔ شُهْرَةٌ کسی امر کی وضاحت ہے اور شَهْرٌ مہینہ کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک مشہور مدت ہے یا چاند دیکھنے کے وقت اس کی شہرت ہو جاتی ہے۔ (غ)

﴿رَمَضَان﴾۔ مہینہ کا نام ہے اور رَمَضٌ سے مشتق ہے جس کے معنی دھوپ کی گرمی کی شدت ہیں۔ (غ) مہینوں کے نام جب دوبارہ رکھے گئے تو اس مہینہ میں گرمی کی شدت تھی۔

فَلْيَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

کو پائے تو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے[229] اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں سے گنتی (پوری) کی جائے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور کہ تم گنتی کو پورا کرو اور اللہ کی بڑائی بڑائی کرو اس لیے کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور تاکہ تم شکر کرو۔[230]

﴿قُرْاٰنُ﴾۔ قَرَأَ سے مصدر ہے جس کے معنی پڑھنا ہیں۔ اور قَرَأَ کے اصل معنی جمع کرنا ہیں اور پڑھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جاتے ہیں۔ (غ) پس ایک معنی کے لحاظ سے قرآن نام اس لیے رکھا گیا کہ یہ تمام علوم کو یا تمام کتب سماوی کی خوبیوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔ (غ) اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ ایک پیشگوئی تھی کہ دنیا کی تمام کتابوں میں پڑھا جانے کے لحاظ سے اس کو خاص امتیاز حاصل ہوگا۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے جس کا اقرار مخالفین اسلام کو بھی ہے کہ قرآن کے برابر دنیا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی (دیکھو انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا)۔ لاکھوں انسان اس کے حافظ ہیں جو دن رات اسے پڑھتے ہیں اور کسی کتاب کے اتنے حافظ دنیا میں نہیں۔ پھر ہر مسلمان پانچ مرتبہ ہر روز اس کا کچھ نہ کچھ حصہ نماز میں پڑھتا ہے۔ یہاں بتا دیا کہ وہ گنتی کے دن جن کے روزے رکھنے کا حکم دیا رمضان کا مہینہ ہے اور اس مہینہ کو خاص فخر یہ حاصل ہے کہ اس میں قرآن اتارا گیا یعنی نزول قرآن اس میں شروع ہوا۔ ابن اسحاق کی روایت پر روح المعانی میں انہی معنوں کو ترجیح دی ہے: [أَيْ اِبْتَدَأَ فِيْهِ إِنْزَالُهُ وَكَانَ ذٰلِكَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ] (روح المعاني، جلد2، صفحہ 61) ''یعنی اس میں نزول کی ابتدا ہوئی اور یہی لیلۃ القدر ہے۔''

یہاں قرآن کریم کے **تین کمالات** کا ذکر فرمایا۔

اول یہ کہ یہ هُدٰی ہے یعنی لوگوں کو سیدھی راہیں بتاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى ہے یعنی دلائل بھی دیتا ہے کہ کیوں فلاں راہ پر چلنا چاہیے یا فلاں راہ سے بچنا چاہیے۔

تیسرا یہ کہ اس کے دلائل حق و باطل میں فیصلہ کر دینے والے ہیں۔ یعنی فی الواقع ایک انسان کو حق الیقین کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔

229- ان الفاظ کی رو سے ان مقامات کو خارج کر دیا جہاں بہت لمبے دنوں کی وجہ سے بارہ مہینوں کی تقسیم مشاہدہ میں نہیں آتی۔ نہ ہلال نظر آتا ہے۔ کیونکہ شَهِدَ میں مشاہدہ ضروری ہے خواہ کسی طرح پر ہو [دیکھو نمبر: 37]۔ ایسی صورت کے لیے [دیکھو نمبر: 235]۔

230- بیمار اور مسافر کے پیچھے روزہ رکھنے کے حکم کو اس لیے دہرایا ہے کہ رمضان کی خاص برکات کے ذکر کی وجہ سے لوگ تکلیف مالا

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو میں قریب ہوں میں دعا کرنے والے کی دعا کو جب وہ مجھے پکارتا ہے قبول کرتا ہوں۔ پس چاہیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور چاہیے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔(231)

یطاق میں نہ پڑیں۔ ﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ﴾ [البقرة: 185:2] ''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے۔'' سے بھی ظاہر ہے کہ بیمار اور مسافر کے لیے رخصت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

231- قَرِیْبٌ۔ لفظ قرب مکان و زمانہ کے لحاظ سے بھی استعمال ہوتا ہے اور نسبت، مرتبہ، علم و قدرت کے لحاظ سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کا قرب بندہ سے جیسا کہ ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ [قٓ: 16:50] ''ہم اس سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔'' میں علم و قدرت کے لحاظ سے ہے اور کبھی بندہ کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذکر ہوتا ہے ﴿اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ [الواقعة: 11:56] ''وہی مقرب ہیں۔'' وہ بلحاظ مرتبہ یا رعایت ہے۔ اِنِّیْ قَرِیْبٌ میں اس قرب مخصوص کا ذکر ہے جو خاص بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس کی طرز بھی آگے بتائی ہے کہ کس طرح ہوسکتا ہے وہ بذریعہ دعا ہے۔

﴿اُجِیْبُ﴾۔ جَوْبٌ کے معنی جَوْبَةٌ یعنی پست زمین کا قطع کرنا ہے۔ چنانچہ قطع کرنے یا تراشنے کے معنی میں ہی ہے ﴿جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ [الفجر: 9:89] ''جنہوں نے وادی میں چٹان تراشے۔'' اور کلام کا جواب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی جوب کو قطع کرتا ہے اور کہنے والے کے منہ سے سننے والے کے کان تک پہنچتا ہے۔ لیکن ابتدائی خطاب کو جَوَابٌ نہیں کہا جاتا۔ پھر جواب دو طرح پر ہے اگر سوال میں کسی بات کا مطالبہ ہے تو اس کا جَوَابٌ بات ہے اور اگر سوال میں کسی فائدہ کا مطالبہ ہے تو وہ فائدہ پہنچانا جَوَابٌ ہے۔ (غ) پس اُجِیْبُ کے معنی جواب دیتا ہوں بھی ہوسکتے اور قبول کرتا ہوں بھی۔ اِسْتِجَابَةٌ اور اِجَابَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی قبول کرنا۔ اس فرق سے کہ اجابت میں ایسا جواب بھی ہوسکتا ہے جو درخواست کی نامنظوری لیے ہوئے ہو۔ اور استجابت میں قبولیت ضروری ہے یہ الفراء کا قول ہے۔ (ر) پھر بندہ کی طرف سے استجابت یا اجابت فرمانبرداری کا اختیار کرنا ہے۔

﴿یَرْشُدُوْنَ﴾۔ رُشْدٌ کے معنی ہدایت پانا ہیں۔ (غ)

اس آیت کو جس میں قرب الٰہی کا ذکر ہے رمضان کے احکام میں لانے سے یہ اشارہ ہے کہ **رمضان میں قرب الٰہی کی راہیں بہت کھل جاتی ہیں۔ اس کا طریق** یہ بتایا کہ دعا کرو تو میرا قرب مل سکتا ہے۔ رمضان میں نبی کریم ﷺ کا طرز عمل یہی بتاتا ہے کہ آپ عبادت اور دعا پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور سخاوت بھی دیگر ایام سے بڑھ کر کرتے تھے۔ گویا یہی مہینہ

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ

تمہارے لیے روزہ کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا حلال کیا گیا ہے[232] وہ تمہارے لیے لباس

مسلمانوں کے لیے مجاہدات کا مہینہ ہے جس کے اندر تزکیہ نفس ہوکر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوسکتا ہے اور انسانی زندگی کی اصل غرض پوری ہوسکتی ہے۔﴿اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ﴾ میں اس تڑپ کا ذکر ہے جو مومنوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔اور دَعْوَةَ الدَّاعِ سے مراد اسی تڑپ کا اظہار ہے جب انسان دعا میں اسے اختیار کرتا ہے۔پس یہاں جس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے وہ **صرف قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی دعا ہے**۔اور جو انسان ایسی دعا کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ بھی ضرور قبول فرماتا ہے۔اسی لیے فرمایا کہ میری فرمانبرداری کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سیدھی راہ پالیں گے یعنی وہ راہ جو میرے قرب میں پہنچا دیتی ہے۔فی الواقع فطرت انسانی جب صفائی پر ہوتی ہے اور روزہ سے اس میں صفائی ضرور آتی ہے تو اس کے اندر یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ قرب الٰہی کو حاصل کرے۔اس قرب کو حاصل کرنے کے لیے بتایا کہ نرے روزے سے ہی نہیں بلکہ پھر دعا بھی ساتھ کرو۔گویا﴿اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ میں روزہ اگر صبر کا پہلو ہے تو صلوٰۃ دعا کا پہلو ہے۔پس یہ مہینہ عبادات کے لیے مخصوص ہے۔

سیاق وسباق عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں انہی دعاؤں کی قبولیت کا ذکر ہے جو قرب الٰہی کے حصول کے لیے کی جائیں۔

عام دعاؤں کا یہاں ذکر نہیں جو بندہ اپنی مصائب کے لیے کرتا ہے۔ان کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے ﴿فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ﴾ [الأنعام: 41:6] یعنی جس مصیبت کو دور کرنے کے لیے تم اسے پکارتے ہو اسے اگر چاہے تو دور کردے۔یعنی یہ ضروری نہیں کہ دنیوی معاملات میں اللہ تعالیٰ ساری دعاؤں کو قبول کرے، جسے چاہے اسے قبول کرے۔اسی لیے دوسری جگہ فرمایا﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾[البقرة: 155:2] یعنی آزمائش کے طور پر اللہ تعالیٰ کچھ تکلیف انسانوں پر بھی وارد کرتا رہتا ہے۔ہاں قرب الٰہی کی راہیں اس قدر کھلی ہیں کہ جب انسان اس کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی پکار کو سن لیتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:﴿الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنكبوت: 69:29] ''جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائیں گے۔''

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر بعض دعائیں قبول نہیں ہوتیں تو دعا ایک لغو امر ہے ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے کہ بعض وقت دوا مفید نہیں پڑتی تو دوا کرنا ہی لغو امر ہے۔جس قدر اسباب دنیا میں ہیں وہ ایک حد تک ہی فائدہ پہنچاتے ہیں۔اور ہر دعا کو قبول کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ خدا حاکم نہیں بلکہ بندہ حاکم ہے کہ جو وہ مانگے خدا کو مجبوراً دینا پڑتا ہے۔وہاں دعا کی قبولیت کا یقین اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے بندوں کو قبل از وقت نتیجہ سے اطلاع دے دیتا ہے۔

232- رَفَثَ۔ ازہری کہتے ہیں کہ یہ ایک کلمہ جامع ہے ان تمام باتوں کے لیے جو مرد عورت سے چاہتا ہے۔اور مفردات راغب میں ہے کہ اس کا استعمال جماع اور اس کے محرکات پر ہے جن کا کھلا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔یہاں مراد جماع ہے۔

لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ

ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو،(233) اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے سو اس نے تم پر رجوع برحمت کیا اور تم کو معاف کیا پس اب ان سے میل جول کرو اور جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے چاہو(234) اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہو جائے پھر رات تک روزے کو پورا

رمضان میں عورت سے رغبت:

بخاری میں براء رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ سارا مہینہ عورتوں کے پاس نہ جاتے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اگر سو جاتے تو پھر اس کے بعد کھانا پینا، عورتوں کے قریب جانا جائز نہ سمجھتے تھے۔ پس یہ حکم نازل ہوا کہ رات کو بی بی کو بلانا جائز ہے۔

233- لباس وہ ہے جو انسان کے قبیح امر کو ڈھانک دے۔ (غ) امام راغب کہتے ہیں کہ میاں کو بی بی کا اور بی بی کو میاں کا لباس قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی محافظت کرتے اور ایک دوسرے کو امر قبیح کے ارتکاب سے بچاتے ہیں۔ مجاہد اور دیگر سلف سے اس کے معنی سَکَنٌ مروی ہیں۔ یعنی عورتیں مردوں کے لیے سکون واطمینان کا موجب ہیں، مرد عورتوں کے لیے۔ اور قرآن کریم نے خود اس معنی کو واضح کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا: ﴿وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا﴾ [الأعراف: 189:7] اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا تا کہ وہ اسے سے سکون پکڑے۔ اور دوسری جگہ ہے: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ [الروم: 21:30] تمہاری جنس سے تمہاری بیبیاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے سکون پکڑو۔ رات کو بھی ایک جگہ سکون اور ایک جگہ لباس کہا ہے اور خود لباس کی غرض قرآن شریف میں یوں بیان کی ہے: ﴿يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا﴾ [الأعراف: 26:7] وہ تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لیے زینت کا موجب ہے۔ پس ایک لطیف استعارہ میں بتایا کہ میاں بی بی کا تعلق کس طرح ایک دوسرے کے لیے تسکین کا موجب ہے اور کس طرح ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہوتی ہے۔

234- ﴿تَخْتَانُوْنَ﴾ ۔ اِخْتِيَانٌ سے ہے۔ امام راغب اختیان اور خیانۃ کے معنی میں یہ فرق کرتے ہیں کہ اختیان کے معنی ہیں خیانت کا ارادہ کرنا گویا خیانت ابھی وقوع میں نہیں آئی۔

نزول حکم قرآنی سے پہلے روزہ میں تشدد:

چونکہ بعض صحابہ کا خیال تھا کہ روزہ میں رات کے وقت بھی بی بی کے پاس نہیں جانا چاہیے گو کوئی حکم الٰہی نازل نہ ہوا تھا اور خواہش

اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

کرو(235) اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو ان سے میل جول نہ کرو۔(236) یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ پس تم

طبعی چاہتی تھی۔ تو اس صورت میں اس تحریک خواہش کو اختیان کہا ہے۔ جو روایتیں اس موقعہ پر بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک شخص بغیر کھائے پیے سو گیا اور اسی بھوک کی حالت میں روزہ رکھا تو اگلے دن اسے غش آ گیا۔ دوسری روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ وہ اپنی بی بی کے پاس گئے بعد اس کے کہ وہ سو گئی تھیں۔ یہ دونوں روایتیں کسی پہلے حکم کی موجودگی کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ اس حکم سے ایک غلط خیال کی تردید ہوئی۔ توبہ اور عفو کے لفظ عام ہیں۔ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے کوئی برا فعل خلاف حکم الٰہی ہو چکا ہے۔ ایک سخت پابندی کی جگہ ایک نرم حکم دے دیا یہ توبہ ہے [دیکھو نمبر: 57] نیز [النسآء: 26:4]۔ جہاں کھول کر بیان کر دینے کو یا شریعت عطا فرمانے کو ﴿يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ﴾ سے ظاہر کیا ہے اور عفو اس کو اس لیے کہا کہ ایک سختی جو مسلمانوں نے اپنے اوپر لازم کر لی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا۔

235- ﴿الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ﴾ خَيْطٌ دھاگے کو کہتے ہیں اور خِيَاطٌ سوئی کو ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الأعراف: 40:7] ''جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو۔'' اور ﴿الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ﴾ صبح کی سفید دھاری کا نام ہے اور ﴿الْخَيْطُ الْاَسْوَدِ﴾ اس کی سیاہی کا۔ یہ معنی خود نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ چنانچہ بخاری میں عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رات کو ایک سفید دھاگا اور ایک سیاہ دھاگا اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیے اور جب آنحضرت ﷺ کو یہ واقعہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: [وِسَادَكَ إِذًا لَّعَرِيضٌ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ (وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ...): 4509) تمہارا تکیہ بڑا فراخ ہے۔ گویا یوں سمجھا دیا کہ وہ خَيْطُ الْاَبْيَضُ اور خَيْطُ الْاَسْوَدِ تکیہ کے نیچے نہیں آ سکتے۔

یہاں روزہ کی حدود بیان کی ہیں:

صبح صادق کے نمودار ہونے تک کھانا پینا جائز ہے اور آفتاب غروب ہوتے ہی افطار کر دینا چاہیے۔ سحری کے وقت میں حتی الوسع تاخیر اور افطار میں حتی الوسع تعجیل کی تاکید نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے۔

جہاں دن لمبے ہوں وہاں روزے کا حکم:

ان حدود پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ بعض جگہ کئی کئی ماہ کا دن ہوتا ہے۔ سو اول تو یہ مقام آباد ہی بہت کم ہیں۔ دوسرے وہاں رمضان کا مہینہ ممیز نہیں ہوتا۔ پس ﴿شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ﴾ میں وہ لوگ نہیں آتے۔ ہاں جہاں اٹھارہ انیس گھنٹے کا دن ہو وہاں روزہ رکھا جا سکتا ہے جن کے لیے تکلیف مالایطاق ہو وہ ﴿فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ پر عمل کریں۔

236- ﴿تُبَاشِرُوْهُنَّ﴾ بَشَرَةٍ ظاہر جلد کو کہتے ہیں یعنی چمڑے کے اوپر کا حصہ اور مباشرۃ دو انسانوں کے چمڑے کا ایک دوسرے کو لگنا ہے۔ یعنی مرد اور عورت کے [لَمْسُ بَشَرَةِ الرَّجُلِ بَشَرَةَ الْمِرْأَةِ] (ن) اس کے اور لَامِسَةٌ کے جو لمس (چھونے) سے

فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ان کے قریب مت جاؤ[237] اس طرح اللہ اپنی باتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ کریں۔

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع 23/6/7

اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور (نہ) ان کے ذریعہ حاکموں تک پہنچو،[238] تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔

ہے ایک ہی معنی ہیں۔ (ن) اور کنایۃً جماع مراد ہے جیسے اس قسم کے دوسرے الفاظ سے بھی، اور یہی معنی یہاں مراد ہے نہ مطلق چھونا۔

﴿عَاكِفُوْنَ﴾۔ عَاكِفٌ مقیم کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں کیا جاتا ہے یعنی دس دن تک انسان بالکل مسجد میں رہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کو مسلمان کا اصلی مجاہدہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اس کے آخری دس یوم کو اور بھی اس مجاہدہ کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ ان ایام میں جو اعتکاف کرتا ہے اسے بی بی سے علیحدہ رہنا چاہیے مگر کسی ضرورت کے لیے بی بی کا اس کے پاس آنا منع نہیں۔

237- ﴿حُدُوْدُ﴾۔ حَدٌّ کی جمع ہے اور یہ اس روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان ہو اور ان کو ایک دوسرے سے ملنے سے روکے۔ اس لیے حد کسی چیز کا وہ وصف ہے جو اسے دوسری چیزوں سے ممیز کر دے۔ (غ) اسی مادہ سے حَادَ ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ [المجادلة: 20:58] ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔'' اور اسی سے حَدِيْدٌ لوہا ہے اور حَدِيْدٌ بمعنی تیز ﴿فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ [قٓ: 22:50] ''پس تیز نگاہ آج تیز ہے۔'' اور حدود اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اس لیے کہ وہ حق و باطل میں حاجز یعنی روک ہیں۔

یہاں حدود کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: [مَنْ يَّرْتَعْ حَوْلَ الْحِمٰى يُوشِكْ أَنْ يُّوَاقِعَهُ] (صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ: 2051) ''جو شخص رکھ کے اردگرد پھرتا ہے قریب ہے کہ اس کے اندر چلا جائے۔''

238- ﴿تُدْلُوْا﴾۔ اِدْلَاءٌ سے ہے جس سے مراد ڈول کا ڈالنا یا نکالنا ہے اور استعارۃً کسی چیز کو ذریعہ بنانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

روزہ اور حرام خوری سے اجتناب:

اس حکم کو رمضان کے ساتھ لانے کا منشاء یہ ہے کہ جب تم میں یہ قوت پیدا ہو گئی کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حلال چیزوں کو بھی جب وہ ترک کر دینے کا حکم دے ترک کر دیتے ہو تو حرام اور باطل کو ترک کرنا کس قدر آسان ہے۔ زیادہ تر مال کی محبت ہی

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪

تجھ سے ہلالوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ یہ لوگوں کے فائدہ کے لیے اور حج کے لیے مقرر وقت ہیں۔(239) اور یہ بڑی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے آؤ، لیکن بڑا نیک وہ ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور

انسان سے گناہ کراتی ہے اس لیے روزہ گناہ سے بچانے کا بڑا موجب ہے۔ کیونکہ روزہ سے انسان کے اندر وہ قوت نشوونما پاتی ہے جس سے وہ مال کے ناجائز کھانے کو ترک کرسکتا ہے۔

239- اَهِلَّةِ۔ هِلَالٌ کی جمع ہے پہلی اور دوسری رات کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد قمر۔ (غ) ہلال کی رؤیت کے ساتھ قمری مہینہ کا آغاز ہوتا ہے۔

﴿مَوَاقِيْتُ﴾۔ مِيْقَاتٌ کی جمع ہے اور یہ وہ وقت ہے جو کسی چیز کے لیے مقرر کیا جائے یا وہ وعدہ جس کے لیے کوئی وقت مقرر کیا جائے۔ (غ) ﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ﴾ [النبأ: 17:78] ''بیشک فیصلے کے دن کا وقت مقرر ہے۔''، ﴿اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ [الواقعة: 50:56] ''ایک مقرر دن کے مقرر وقت پر۔''

ہلالوں کے متعلق سوال سے کیا مطلب ہے:

ایسے جس قدر سوال ہیں ان سب میں احکام دریافت کیے ہیں: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ﴾۔ یتیموں کے احکام دریافت کرتے ہیں۔ شراب اور جوئے کے احکام دریافت کرتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ یتیم کس طرح بنتا ہے؟ شراب کس طرح بنتی ہے؟ جوا کس طرح کھیلا جاتا ہے؟ پس ہلالوں کے بھی احکام دریافت کرتے ہیں اور ہلالوں سے مراد مہینے ہیں۔ یہ سوال خاص مہینوں یا ہلالوں کے متعلق ہے جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے ﴿هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ﴾ اور یہ خاص مہینے فی الواقع رمضان کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہوجاتے ہیں۔ یعنی شوال، ذیقعد اور دس دن ذی الحج کے، یہ حج کے مہینے ہیں۔ عرب میں یہ مشہور مہینے تھے جن کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ جب رمضان کے اس قدر فضائل کا ذکر ہوا تو ان مہینوں کا سوال بھی پیدا ہوا جو رمضان کے ساتھ ہی شروع ہوجاتے ہیں۔ مگر چونکہ حج کے مہینوں میں دو مہینے حرمت والے بھی ہیں ان کا ذکر بھی ساتھ ہی کردیا۔ حرمت کے مہینے کل چار ہیں یعنی محرم، رجب، ذیقعد، ذی الحج۔ عرب میں ان ایام میں جنگ بالکل بند ہوجاتی تھی، راستے کھل جاتے تھے، تجارتیں شروع ہوجاتی تھیں۔ انہی میں حج کے ایام بھی آجاتے تھے۔ اس لیے ﴿مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ﴾ فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لیے اوقات مقررہ۔ ورنہ عرب جیسی جنگجو قوم تھی اگر ان مہینوں کی وجہ سے ان کی تجارتیں وغیرہ سال میں چار ماہ کھلی نہ رہتیں تو بالکل برباد ہوجاتے۔ اگر کل مہینوں کے متعلق سوال ہوتو بھی حرج نہیں کیونکہ سبھی مہینے لوگوں کے لیے وقت مقرر ہیں۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔(240)

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو اللہ زیادتی کرنے والوں

240- ﴿اَبْوَابٌ﴾۔ بَابٌ کی جمع ہے۔ دروازہ کو کہتے ہیں۔ شہر کا ہو یا مکان کا یا کوٹھڑی کا اور کسی چیز کا باب وہ ذریعہ ہے جس ذریعہ سے اس چیز تک پہنچ سکیں۔ جیسے حدیث میں ہے:[أَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا] (كنزالعمال: 32890) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾[الأنعام: 44:6] ''ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔'' اور﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ﴾[الرعد: 23:13] ''اور فرشتے ان پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے۔'' جس کے معنی کیے ہیں ہر ایک قسم کی خوش کرنے والی چیزوں سے۔ (غ) امام راغب کے نزدیک اَبْوَابُ الْجَنَّةِ اور اَبْوَابُ الْجَهَنَّم سے وہ اسباب مراد ہیں جو انسان کو جنت یا دوزخ میں پہنچاتے ہیں۔

بَيْت۔ بَاتَ۔ کے معنی ہیں رات کاٹی اور اس لیے بَيْتٌ اصل وہ مکان ہے جہاں انسان رات کاٹے۔ پھر عام ہر ایک مسکن کو کہتے ہیں۔ (غ) اور مجازاً دل کو جیسا کہ امام راغب نے اس حدیث کے معنی میں قول نقل کیا ہے:[لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ] (صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب إِذَا قَالَ أَحَدُكُمْ آمِينَ . وَالْمَلاَئِكَةُ فِي السَّمَاءِ ، فَوَافَقَتْ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ: 3225) فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویر ہو کہ بَيْتٌ سے مراد یہاں دل اور کلب سے مراد حرص ہے۔ اور بعض کے نزدیک گھر کے دروازہ سے داخل ہونا کنایہ ہے سیدھی راہ اختیار کرنا۔ اور پچھواڑے کی طرف سے آنا، کنایہ ہے سیدھی راہ سے انحراف کرنے سے۔

عرب کی توہم پرستی:

حسن اور اصم کا قول ہے کہ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص کسی مقصد کو سامنے رکھ لیتا اور اس کا حاصل کرنا مشکل ہوتا تو وہ ایک سال تک گھر کے پچھواڑے کی طرف سے داخل ہوتا اور اس کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتا۔ مسلمانوں کو بتایا ہے کہ تمہاری کامیابی کا مدار ایسی توہم پرستیوں پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق اور ذمہ داریوں کی حفاظت پر۔ چونکہ اصل مضمون استعانت بالصبر والصلوٰۃ تھا اس لیے اس سے روکا ہے کہ کامیابی کا مدار توہم پرستی پر رکھا جائے۔ بخاری میں ہے کہ احرام کی حالت میں خمس کے سوائے دوسرے لوگ گھر کے پچھواڑوں میں سے داخل ہوتے تھے چونکہ حج کا ذکر آیا تھا اس لیے اس رسم کو دور کرنے کا حکم یہاں دیا ہے۔ چونکہ رمضان کو حج کے ساتھ خاص تعلق ہے یعنی جیسے رمضان کی دس راتیں بڑی فضیلت والی ہیں جن کا ذکر آخری سے پہلی آیت رکوع گزشتہ میں کیا ہے۔ اسی طرح ذی الحج کی دس راتیں بھی خاص فضیلت

يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ سے پیار نہیں کرتا۔(241)

رکھتی ہیں۔اس لیے حج میں جوتو ہم پرستی کی باتیں تھیں ان کو دور کر دیا اور جو ارکان روحانی معنی رکھتے تھے ان کو باقی رکھا۔

241- ﴿قَاتِلُوْا﴾۔ مُقَاتَلَةٌ کے معنی مُحَارَبَةٌ ہے یعنی ایک دوسرے سے جنگ کرنا یا ایک دوسرے کو قتل کرنے کا قصد کرنا۔

یہاں سے جنگ کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اس کا تعلق ماسبق سے دو طرح پر ہے ایک تو پہلے صاف کہا گیا تھا کہ تم کو خانہ کعبہ کا متولی بنایا جائے گا مگر اس کے لیے صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ خدا کی مدد چاہو اور اس راہ میں تم میں سے لوگ شہید بھی ہوں گے۔ پس اب اس مضمون کو کھول کر بیان کیا ہے کہ جنگ کی اجازت کس حد تک ہے۔ دوسرے جب حرمت والے مہینوں کا سوال آیا اور ان میں جنگ کے بند رہنے کو لوگوں کے فائدہ کی بات قرار دیا۔ تو اب جنگ کے احکام کو بھی بیان کر دیا جو دراصل يَسْئَلُوْنَكَ کا جواب ہے اور خود حج کا ذکر بھی چاہتا تھا کہ بتایا جائے کہ اسلام کا یہ عظیم الشان رکن کس طرح ادا ہوسکتا ہے؟ جب خانہ کعبہ کافروں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لیے آگے آتا ہے ﴿وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ یعنی مکہ سے تو یہ کافر ضرور نکالے جائیں گے مگر وہ بغیر جنگ کے ناممکن تھا۔ اس لیے احکام جنگ کا ذکر ضروری ہوا۔ سورۂ حج میں بھی بعینہٖ اسی کے مطابق حج کے ذکر کے ساتھ جنگ کے اذن کا ذکر شروع ہوتا ہے ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ﴾ [الحج: 39:22] ''ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔''

یہاں حکم فی سبیل اللہ جنگ کرنے کا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

فتوحات ملکی کے لیے یہ جنگ نہیں۔ حفاظت قومی کے لیے بھی نہیں بلکہ اس لیے کہ اللہ کا نام یہ کافر نہ مٹا دیں اور مسلمانوں کو خدا کی عبادت سے جو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے نہ روکیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن جو آپ کی پہلی جنگ تھی، ان الفاظ میں دعا کی [اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ أَهْلِ الإِسْلامِ فَلَا تُعْبَدْ فِي الأَرْضِ أَبَدًا] (مسند أحمد، جلد 1، صفحہ 334؛ مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الدعاء، باب ما دعا بِهِ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يوم بدرٍ ويوم حنين: 30199) ''اے خدا اگر تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری پرستش پھر کبھی نہ ہوگی۔'' اور خود قرآن شریف میں دوسری جگہ اسی جنگ کی غرض کو یوں بیان کیا ہے: ﴿وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ﴾ [الحج: 40:22] ''اگر اللہ بعض لوگوں (یعنی کفار) کو بعض (یعنی مسلمانوں) کے ذریعہ سے نہ روک دیتا تو راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجا گھر اور دیگر مذاہب کے عبادت خانے اور مسجدیں سب ویران کر دی جاتیں'' اور یوں اللہ کا ذکر دنیا سے مٹا دیا جاتا۔ **پس اسی مذہبی آزادی اور امن کا قائم کرنا ہی فی سبیل اللہ ہے اور اسلامی جنگوں کی پہلی شرط یہی ہے۔**

مگر اسی آیت میں جنگ کرنے کے متعلق دو اور شرائط بھی لگا دیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ جو فی الواقع جنگ میں شامل نہ ہوں یا جو جنگ میں ابتدا نہ کریں، ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ حد سے نہ بڑھو۔ یعنی حالت جنگ میں اپنے حق سے یا ضرورت جنگ سے تجاوز نہ کیا جائے۔ خواہ مخواہ اتلاف

وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ

اور جہاں ان کو پاؤ مارو اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے(242) اور فتنہ قتل سے بڑھ کر سخت ہے(243) اور مسجد حرام کے قریب ان سے جنگ نہ

جان و مال نہ ہو۔ جہاں کہیں قرآن شریف میں کسی قوم سے قتال کا حکم یا اجازت ہے وہ انہی تین شرائط کے ماتحت ہے اور بغیر اس کے جائز نہیں۔ ان تین شرائط نے اسلامی جنگوں کو نہ صرف یہودی جنگوں کے مقابلہ پر رحمت ہی رحمت کر دیا کیونکہ یہودی غیر قوم کے بوڑھوں، بچوں، عورتوں تک کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔ مویشیوں کو فنا کر دیتے تھے اور مکانوں، کھیتوں، باغوں، اموال کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ بلکہ اس بیسویں صدی کی مہذب اقوام کی جنگ کے مقابل میں بھی اسلامی جنگ نری رحمت نظر آتی ہیں۔ پھر ساتھ تقویٰ اور اعتدال اور انصاف اور عفو کا حکم بھی موجود ہے۔

242- ﴿ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ ثَقْفٌ کے اصل معنی کسی چیز کے پانے یا کرنے میں دانائی ہیں۔ (غ) اور گو اصل معنی تجاوز کر کے مطلق پا لینے پر بھی اسی لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مگر یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں جیسا کہ ابن جریر نے کہا ہے: [فِيْ أَيِّ مَكَانٍ تَمَكَّنْتُمْ * مِنْ قَتْلِهِمْ وَأَبْصَرْتُمْ مُقَاتِلَهُمْ] یعنی جہاں ان کو قتل کرنے کی قدرت ہو اور ان کے جنگ کرنے کو دیکھو۔

وَ اقْتُلُوْهُمْ میں ضمیر انہی لوگوں کی طرف جاتی ہے جن کا پیچھے ذکر ہے یعنی ﴿الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہیں ان کو جہاں پاؤ مارو۔ یہ نہیں کہ کسی غیر مسلم کو جہاں پاؤ مارو۔ اور ثَقِفْتُمُوْهُمْ کا لفظ اختیار کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اندھا دھند مارنا مراد نہیں صرف جنگ میں مارنا جائز ہے۔

دوسرے فقرے میں جنگ کی حد کو بیان کیا ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو بلا وجہ مکہ سے نکالا تھا اور اب وہ وہاں اغراض مذہبی کے لیے یعنی حج کے لیے بھی نہ جا سکتے تھے۔ اس لیے بتایا کہ جنگ ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے تم کو مکہ سے نکالا ہے اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ مکہ سے نکالے جائیں۔ اس میں آخری فتح کی صریح پیشگوئی بھی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمہارے جنگ اپنے حقوق کو واپس لینے کے لیے ہے۔

243- فِتْنَةٌ۔ اصل معنی فَتَنٌ کے سونے کا آگ میں ڈالنا ہے تا کہ کھرا پن اس کے کھوٹ سے الگ ہو جائے۔ اس لیے محض آگ میں ڈالنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝﴾ [الذاريات: 13:51] ''جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے۔'' اس لیے فِتْنَةٌ عذاب اور دکھ وغیرہ دینے کے معنی میں آتا ہے۔ (غ) قرآن شریف میں ان دکھوں اور تکلیفوں پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے جو کفار مومنین کو دیتے رہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ [البروج: 10:85] ''وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دکھ دیتے ہیں۔''، ﴿فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ﴾ [العنكبوت: 10:29] ''پھر جب اللہ کے لیے انہیں دکھ اٹھانا پڑتا ہے تو لوگوں کو دکھ دینے کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھتے ہیں۔'' جہاں صاف اللہ کی راہ میں ایذا دیا جانے کو فتنہ قرار دیا ہے اور بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے: [وَكَانَ الإِسْلاَمُ قَلِيلًا، فَكَانَ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

کروجب تک کہ وہ اس کے اندر تمہارے ساتھ جنگ (نہ) کریں پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو مارو۔ کافروں کی یہی سزا ہے۔(244)

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

پھر اگر وہ رک جائیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(245)

الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِي دِينِهِ إِمَّا قَتَلُوهُ، وَإِمَّا يُعَذِّبُوهُ، حَتَّى كَثُرَ الإِسْلاَمُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ (وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِينَ): 4514)
اسلام حالت غربت میں تھا اس لیے ایک شخص کو اس کے دین کی وجہ سے دکھ دیا جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے یا عذاب دیتے۔ یہاں تک کہ اسلام بڑھ گیا پھر فتنہ نہ رہا۔ اور مفردات میں ہے کہ فتنہ بلاؤں اور مصیبتوں اور قتل اور عذاب وغیرہ افعال کریہہ پر بولا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے اور وہ بمقتضائے حکمت الٰہی ہوتا ہے۔ پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دکھ دیئے جاتے ہیں اور ملک میں بے امنی کی حالت ہے وہ قتل سے بڑھ کر ہے۔

244- **مسجد حرام میں جنگ کی ممانعت:** باوجود یکہ یہ بھی بتا دیا کہ مسجد حرام یعنی مکہ سے یہ لوگ نکال دیئے جائیں گے پھر بھی اس کی حرمت کی وجہ سے اس کے قریب بھی جنگ کرنے سے روک دیا۔ ہاں اگر کافر حدود حرم کے اندر جنگ میں ابتدا کریں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت دی گئی۔

245- ﴿اِنْتَهَوْا﴾ نَهْیٌ کسی چیز سے روکنا۔ ﴿تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: 110:3] ''اور برے کاموں سے روکتے ہو''، ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝﴾ [العلق: 96:9-10] ''کیا تو نے اسے دیکھا جو بندے کو روکتا ہے۔ جب وہ نماز پڑھتا ہے۔'' اور اِنْتِهَاءٌ کے معنی اس چیز سے رک جانا جس سے روکا گیا ہے۔ (غ) ﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى﴾ [البقرة: 275:2] ''سو جس کے پاس اپنے رب سے نصیحت آ گئی پھر وہ رک گیا''، ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ﴾ [مریم: 46:19] ''اگر تو باز نہ آئے میں تجھے سنگسار کروں گا۔''

کفار کے جنگ سے رُک جانے کی صورت میں حکم:

چونکہ اصل حکم جنگ کا اس لیے دیا تھا کہ یہ تم سے جنگ کرتے ہیں پس مطلب یہ ہے کہ اگر جنگ سے رک جائیں یا چونکہ اوپر فتنہ کا ذکر ہے یعنی مسلمانوں کو دکھ دینے کا تو مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو دکھ دینا چھوڑ دیں تو تم بھی جنگ نہ کرو اللہ ان کے پہلے قصور بخش دے گا۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو، پھر اگر وہ رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لیے نہیں۔ (246)

246- فِتْنَةٌ کے معنی ابھی لغت سے، قرآن سے، حدیث سے بیان ہو چکے [دیکھو نمبر: 243] پس ﴿وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دکھ نہ دیا جائے۔ لیکن اس کے آگے جو الفاظ آتے ہیں ﴿وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ اور دین اللہ کے لیے ہو۔ ان سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام ہی اسلام ملک میں ہو۔ مگر یہ معنی اول تو خود ﴿لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ کے خلاف ہیں اور دوسرے قرآن شریف کی ان آیات کے بھی خلاف ہیں جن میں کفار سے صلح کر لینے کا حکم ہے۔ ﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ [الأنفال: 61:8] ''اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا۔'' پھر نبی کریم ﷺ کے عمل کے خلاف ہیں کہ آپ نے اس وقت تک جنگ نہیں کی کہ اسلام ہی اسلام ہو، صلح حدیبیہ میں کفار کی پیش کردہ شرائط پر صلح کی یہاں تک کہ جو کافروں میں سے مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے ان کو بھی واپس کر دینا منظور کیا۔ پھر فتح مکہ میں اہل مکہ کو حالت کفر پر چھوڑ کر معاف کر دیا۔ حتی کہ کفر کی حالت میں ان میں سے بعض لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں شامل ہوتے رہے۔ پھر آپ کے پاس نویں اور دسویں سال ہجرت میں وفد پر وفد مشرکوں کے آتے تھے۔ اگر مشرکوں سے جنگ کا حکم ہوتا تو یہ لوگ کس طرح حالت شرک میں رہ کر مدینہ میں آسکتے تھے؟ پھر آپ کی وفات کے وقت بھی یہود و نصاریٰ عرب میں موجود تھے۔ دین اسلام تو پھر بھی اکیلا عرب میں نہ تھا۔ پھر ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ میں تو اس کے بعد چل کر یہ کہا کہ دین میں جبر نہیں۔ تو یہاں بجز مسلمان کرنے کی تعلیم کیونکر ہو سکتی ہے۔ پس جو معنی خلاف سیاق و سباق، خلاف قرآن، خلاف عمل نبوی ہیں وہ کسی طرح قابل قبول نہیں۔

﴿يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ کے معنی صاف ہیں۔ دین اللہ کے لیے ہو۔ جب دین کے لیے کوئی دکھ دینے والا نہ ہو تو دین اللہ کے لیے ہوگا۔ یہی معنی ﴿لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ ... الآية﴾ [الحج: 40:22] ''تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں گرا دی جاتیں۔'' میں ہیں کہ جنگ کی غرض دنیا میں مذہبی آزادی کا قائم کرنا ہے اور یہی معنی ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ کے ہیں دین میں کوئی جبر نہ رہے۔ بخاری کی حدیث سے بھی یہی معنی ثابت ہیں جہاں ﴿يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ کے ماتحت امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو لائے ہیں کہ جب ان سے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے معاملہ میں شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا: [قَاتَلْنَا حَتّٰى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ، وَكَانَ الدِّينُ لِلّٰهِ، وَأَنْتُمْ تُرِيدُونَ أَنْ تُقَاتِلُوا حَتّٰى تَكُونَ فِتْنَةٌ، وَيَكُونَ الدِّينُ لِغَيْرِ اللّٰهِ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ (وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلاَ عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ): 4513) ''یعنی ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا اور دین اللہ کے لیے ہو گیا اور تم جنگ کرنا چاہتے ہو یہاں تک کہ فتنہ ہو اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔'' جس کے صاف معنی ہیں کہ ہم نے جنگ کر کے مذہبی آزادی کو قائم کیا تم

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور تمام حرمت والی چیزوں میں بدلہ ہے (247) پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے (248) اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ ع

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو (249) اور احسان کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

جنگ کر کے مذہبی آزادی کو دور کرنا چاہتے ہو۔ کیونکہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے معاملہ میں دو مسلمان گروہ جنگ کرنے والے تھے اور کافروں کے غلبہ کا کوئی سوال نہ تھا۔

عُدْوَانٌ کے معنی یہاں زیادتی کی سزا ہے۔ [دیکھو نمبر: 248]

247- **حرمت کے مہینوں میں جنگ سے رکنے کا حکم:** یہاں صاف حکم دیا کہ اگر حرمت والے مہینوں اور تمام حرمت والی اشیاء کا مسلمانوں کو پاس کرنا چاہیے، یہاں تک کہ کافران میں ابتدا کریں۔ تب قصاص کے طور پر وہ بھی جنگ کریں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حرمت والے مہینوں میں جنگ نہ کرتے تھے اور جنگ کرتے کرتے حرمت والا مہینہ آجاتا تو وقفہ کر دیتے۔ چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں آپ نے جنگ کرنے سے انکار کیا اور جنگ ہوازن میں حرمت والے مہینہ کی وجہ سے جنگ کو روک دیا۔ (ت)

248- اِعْتِدَاءٌ کے اصل معنی مُجَاوَزَةُ الْحَقِّ ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب دشمن نے حق سے تجاوز کیا تو اب اس کے خلاف کارروائی حق سے تجاوز نہیں بلکہ عین حق ہے۔ اس لیے دوسرے اِعْتِدَاءٌ کے معنی [مُجَازَاةُ عُدْوَانٍ] ہیں یعنی زیادتی کا بدلہ یا اس کی سزا۔ اور یہ اسی کے مطابق ہے جو جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ کو قرآن کریم نے خود سَيِّئَةٌ کہا ہے حالانکہ سزا فی الواقع برائی نہیں ہے۔ اسی لیے مفردات میں ﴿فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ﴾ کے معنی کیے ہیں [قَابِلُوْهُ بِحَسْبِ اِعْتِدَائِهٖ] اس کی زیادتی کے مطابق اس کا مقابلہ کرو۔

249- اَلتَّهْلُكُ۔ هَلَكَ سے ہے اور هَلَكَ موت کو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے ہاتھ سے جاتے رہنے کو بھی گو وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴾ [الحاقة: 29:69] اور بگاڑ اور فساد سے بھی ہلاک ہوتا ہے۔ ﴿يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾ [205] اور اَلتَّهْلُكَةِ وہ ہے جو ہلاکت کی طرف لے جائے۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ

اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو جو کچھ قربانی آسانی سے میسر آئے کرو اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ، یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔(250) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر

فی سبیل اللہ اموال کا خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے: اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بخاری میں اس کے متعلق ہے [نَزَلَتْ فِي النَّفَقَةِ](صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ (وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ وَلاَ تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ): 4516) یعنی یہ آیت خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس مراد اس سے یہ ہوئی کہ خدا کی راہ میں جب جنگ کرو گے تو اموال کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ اس لیے اپنے اموال کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرو یا یہ مراد ہے کہ حفاظت دین کے لیے اگر اس وقت تلوار اٹھانے کی ضرورت ہے تو کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ صرف مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت مال خرچ کرنا اور ہلاکت سے بچنا۔ قسطنطنیہ کے حملہ میں جو صحابہ کے زمانہ میں ہوا ایک شخص صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا تو بعض نے کہا [أَلْقٰى بِيَدِهٖ إِلَى التَّهْلُكَةِ] اپنے آپ کو اپنے ہاتھ سے ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس آیت کے یہ معنی نہیں۔ [فَكَانَتِ التَّهْلُكَةِ فِي الْإِقَامَةِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ وَتَرْكِ الْجِهَادِ] (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب السير، باب مَا جَاءَ فِي قَوْلِ الله عَزَّ وَجَلَّ (وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ وَلاَ تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ): 18387) ہلاکت تو اس میں تھی کہ ایک شخص اپنے اہل اور مال میں بیٹھا رہے اور جہاد کو ترک کر دے۔ اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ احسان کی ترغیب پر کیا ہے۔ آج بھی گھروں میں بیٹھ رہنے میں ہلاکت ہے اور اشاعت اسلام پر اموال کو خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی میں مسلمانوں کا بچاؤ ہے۔

250- اُحْصِرْتُمْ۔ اِحْصَارٌ دشمن کے روکنے اور بیماری کے روکنے دونوں پر بولا جاتا ہے اور حَصْرٌ صرف آخر الذکر پر۔ (غ)

الْهَدْيُ۔ هَدْيَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی تحفہ ہیں ﴿بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ﴾ [النمل: 36:27] ''بلکہ تم اپنے تحفہ پر اتراتے ہو'' اور هَدِيٌ خاص ہے قربانی کے جانوروں کے لیے جو خانہ کعبہ کو لے جائے جاتے ہیں اونٹ ہو یا گائے، بکری یا بھیڑ۔ (غ)

مَحِلّ۔ حَلّ سے ظرف مکان بھی ہوسکتا ہے اور ظرف زمان بھی۔ قربانی کے اپنے محل پر پہنچنے سے کیا مراد ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ [الحج: 33:22] ''ان کی آخری منزل قدیم گھر کی طرف ہے۔'' کے ماتحت قربانی کا بہرحال خانہ کعبہ میں پہنچانا ضروری ہے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے روکنے پر حدیبیہ کے مقام پر جو مکہ سے نو میل ہے قربانیاں کر دی تھیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ وہ جگہ بھی حرم میں داخل تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دشمن روک دے اور قربانیاں

اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ
صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۫
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا
اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ
اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ
لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
24 ع 8 8 شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۧ ﴿۱۹۶﴾

میں کچھ دکھ ہوتو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے دے۔(251) پھر جب تم امن میں ہو تو جو کوئی حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اٹھائے تو جو قربانی آسانی سے میسر آئے کر دے اور جو نہ پائے تو تین دن کے روزے حج میں رکھے، اور سات جب تم لوٹ کر آؤ، یہ پورے دس ہیں۔ یہ اُس کے لیے ہیں جس کے اہل مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں۔(252) اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے۔

حرم میں نہیں پہنچائی جاسکتیں تو کیا کرے۔ پھر اس علم کا حاصل ہونا جیسا کہ امام صاحب نے شرط لگائی ہے کہ قربانی حرم میں پہنچ گئی ہے۔ نہ صرف قرآن شریف میں مذکور نہیں بلکہ ویسے بھی مشکل ہے۔ پس ایسی صورت میں محل وہی ہے جہاں روکا گیا ہے۔ یعنی وہیں قربانی کر دے۔ ہاں بیماری کی صورت میں قربانی خانہ کعبہ میں بھی پہنچائی جاسکتی ہے تو اس صورت میں محل بھی وہی ہوگا۔ آیت ماقبل سے یہ تعلق ہے کہ وہاں جنگوں کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن حج کرنے سے روکتے تھے یا یوں کہنا چاہیے کہ جنگ کا ذکر یہاں بطور جملہ معترضہ آ گیا ہے۔ اصل مضمون حج ہے جس سے رکوع شروع کیا تھا اور حج پر ہی ختم کیا ہے اور اگلے رکوع میں بھی حج کا ہی ذکر ہے۔ چونکہ حج میں اس وقت رکاوٹ تھی اس لیے درمیان جنگوں کا ذکر کرنا پڑا۔ اور سر منڈوانے سے مراد حالت احرام سے باہر نکلنا ہے۔ یعنی اس حالت سے جب انسان احرام باندھتا اور صرف دو بن سلی چادروں میں ملبوس ہوتا ہے اور جب ارکان حج پورے ہو جاتے ہیں تو اس وقت سر منڈوا کر یا بال چھوٹے کرا کر حاجی حالت احرام سے باہر نکلتا ہے اس لیے سر منڈوانا گویا حالت احرام سے نکل آنا ہے۔

251- نُسُكٌ کے اصل معنی [نمبر: 163] میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہ نَسِيْكَةٌ کی جمع بھی ہے جس کے معنی قربانی ہیں۔

یعنی بیماری کی وجہ سے سر کے بال کٹوانے پڑیں یا اور کوئی فعل حالت احرام کے خلاف کرنا پڑے۔ جیسے لباس کے معاملہ میں تو اس کا فدیہ دے دے۔ صحیح بخاری میں تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کا کھانا یا قربانی سے اس کی تفسیر کی ہے۔

252- ﴿تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ متاع کے معنی [نمبر: 161] میں بیان ہو چکے ہیں اور مُتْعَةُ الْحَجِّ خاص اصطلاح ہے یعنی عمرہ کا حج کے ساتھ خاص طریق پر ملانا اور حج تین قسم پر ہے۔ **افراد۔ قران۔ تمتع۔**

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ

حج کے معلوم مہینے ہیں۔ پس جس نے ان میں اپنے اوپر حج لازم کرلیا تو حج میں نہ فحش کلام اور نہ گالی گلوچ اور نہ کوئی جھگڑا ہو اور جو کچھ تم نیکی کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے[253] اور زاد (راہ) لے لیا کرو البتہ بہترین

افراد یہ ہے کہ حج اور عمرہ علیحدہ علیحدہ کرے۔ مثلاً حج کے بعد عمرہ کے لیے احرام باندھے یا حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کرلے اور پھر اسی سال حج کے مہینوں میں حج کرے۔

قران یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ اور حج کی اکٹھی نیت کرے اور دونوں کے لیے احرام باندھے اور جب تک دونوں نہ کرلے احرام نہ کھولے۔ یا حج کے مہینوں میں عمرہ کے لیے احرام باندھے اور احرام کھولنے سے پہلے حج کو ساتھ ملائے۔

اور تمتع یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کے لیے احرام باندھے۔ پھر عمرہ کرکے احرام کھول دے اور حج کے دنوں میں حج کے لیے احرام باندھے۔ گویا یوں عمرہ کے ساتھ ملا کر انسان فائدہ اٹھا لیتا ہے، اس کے لیے بھی فدیہ قربانی یا دس روزے قرار دیئے۔

253- فَرَضَ۔ فَرْضٌ سخت چیز کے کاٹنے اور اس میں اثر کرنے کو کہتے ہیں۔ اور اس لیے کسی چیز میں حکم کے قطع کرنے کو بھی فرض کہا جاتا ہے۔ اور وہ ایجاب کی طرح ہے مگر ایجاب یا واجب کرنا بلحاظ وقوع اور ثبات بولا جاتا ہے اور فرض قطع حکم کے لحاظ سے۔ (غ) پس فرض کے معنی لازم کردیا یا واجب کردیا۔ اور ﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا﴾ [النور: 1:24] ''(یہ) ایک سورت ہے جسے ہم نے اتارا ہے اور اس (کے احکام کو) ضروری ٹھہرایا ہے۔'' میں فَرَضْنَا کے معنی ہیں ہم نے تجھ پر اس پر عمل کرنا واجب کردیا اور یہی معنی ﴿اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ﴾ [القصص: 85:28] میں ہیں یعنی وہ جس نے قرآن پر عمل کرنا تجھ پر واجب کردیا۔

فُسُوْقٌ۔ فِسْقٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 41]۔ مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن عمر رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہ سے یہاں سِبَابٌ یعنی گالی دینا معنی مروی ہیں۔ ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ﴾ [الحجرات: 11:49] ''برا نام کیا ہی برا ہے۔'' سے ظاہر ہے کہ فسوق ہر وہ نام ہے جسے انسان ناپسند کرے۔ چنانچہ یہی معنی تاج العروس میں دیئے ہیں۔ حدیث میں بھی ہے: [سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ] (صحيح البخاري، كتاب2، باب36، حديث:48) پس یہاں گالی مراد ہے۔

حج کا ذکر گزشتہ رکوع سے چلتا ہے۔ یہاں اول فرمایا کہ **حج کے مہینے** مشہور ہیں۔ شوال، ذیقعد اور دس دن ذی الحج کے۔ حج کا احرام صرف انہی دو ماہ اور دس دن میں باندھا جاسکتا ہے۔

حج کی غرض:

حج میں تین باتوں سے خصوصیت سے روکا ہے۔ ایسی کلام سے جو مرد و عورت کے تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گالی دینے

التَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ توشہ تقویٰ ہے اور اے عقل والو میرا تقویٰ اختیار کرو۔(254)

سے، جھگڑا کرنے سے۔ ان تینوں باتوں میں یہ اشارہ ہے کہ حج کی غرض کیا ہے اور وہ انسان کو کس مقام پر پہنچاتا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حج مومن کا عاشقانہ فعل ہے یعنی جذبہ عشق الٰہی اس میں پایا جاتا ہے۔ اپنے محبوب کے کوچہ کی زیارت کے لیے وطن سے بے وطن ہوتا ہے۔ لباس بھی آسائش والا ترک کر دیتا ہے۔ وہاں جا کر اس کے گھر کے گرد گھومتا ہے، دوڑتا ہے۔ پس جب حج میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جذبہ عشق الٰہی کے سامنے سارے جذبات اور محبتیں ٹھنڈی پڑ جائیں تو عشق و محبت دنیوی میں جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی محبت ہے یعنی مرد اور عورت کا تعلق اس کے متعلق کلام کرنے سے بھی روکا تا کہ اس اصل جذبہ عشق میں کسی اور محبت کی آمیزش نہ ہو۔ دوسری **غرض حج کی مساوات انسانی کو دکھانا** ہے جہاں بادشاہ سے لے کر گدا تک ایک ہی لباس میں ملبوس کھڑے ہوں۔ کیونکہ خدا کے حضور سب انسان یکساں ہیں۔ اس لیے گالی دینے سے بھی روکا، مساوات انسانی مبنی ہے، حفاظت خون پر، حفاظت مال پر، حفاظت عزت پر، اسی آخری بات کو لوگ جلد بھول جاتے ہیں۔ اسی لیے بتایا کہ حج میں کوئی ایسا فعل بھی نہ ہو جو مساوات نسل انسانی کے نقیض ہو اور **حج چونکہ روحانیت کی منزل کا آخری مقام** ہے اور جھگڑے اطمینان قلبی کو تباہ کرنے والی چیز ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ حج میں جھگڑا بھی نہ کرو تا کہ تمہارے اس اطمینان روحانی میں جو حج میں حاصل ہونا چاہیے کوئی امر مخل نہ ہو۔ اور آخر پر فرمایا کہ نیکی بھی کرو تا کہ اللہ جو تمہاری نیکیوں کو جانتا ہے تمہیں اجر دے۔ گویا صرف چند ناپسندیدہ امور سے رکنا ہی ترقی کی آخری منزل نہیں بلکہ ان سے رکتے ہوئے ساتھ ہی نیکی میں ترقی کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی کرے۔ دوسرے لوگوں کی خدمت کرے اور محبت اور الفت کے تعلقات کو جو محض خدا کے لیے ہوں بڑھائے۔

254- ﴿تَزَوَّدُوْا﴾ اس کا مادہ زَادٌ ہے اور زِيَادَةٌ بڑھانے کو کہتے ہیں۔ (غ) ﴿وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ﴾ [يوسف: 65:12] ''اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائیں گے''، ﴿مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا﴾ [الأحزاب: 22:33] ''اس نے انہیں صرف ایمان اور فرمانبرداری میں بڑھایا''، ﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ [البقرة: 10:2] ''سو اللہ نے ان کی بیماری کو بڑھایا'' اور زَادٌ اس ذخیرہ کی گئی چیز کو کہا جاتا ہے جو ما یحتاج وقتی سے زیادہ ہو اور تَزَوَّدَ کے معنی زادِ راہ لے لینا۔

حج میں زادِ راہ کی ضرورت ہے:

حج میں عاشقانہ رنگ تو سکھایا مگر وہ امور جن کو بعض لوگوں نے عاشقانہ فعل تصور کر کے اختیار کیا ہوا تھا اور حقیقت میں وہ نقص تھے ان سے روک بھی دیا۔ بخاری میں ہے کہ اہل یمن حج کرتے تو زادِ راہ نہ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں اور ایک روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے کہ بعض لوگ حالت احرام میں سفر خرچ کو پھینک دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا سوال کرتے یا چوری یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لیتے کیونکہ اس کے بغیر تو زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اس لیے فرمایا کہ زادِ راہ ساتھ لے لیا کرو ورنہ کم از کم سوال تو کرنا پڑے گا۔ اس میں مسلمان کو اعلیٰ درجہ کی خودداری سکھائی ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَ اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب سے فضل کی طلب میں لگو۔[255] پھر جب تم عرفات سے نکلو تو مشعر الحرام کے اللہ کا ذکر کرو[256] اور اسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی اور گو اس سے پہلے تم جس طرح تم اپنے بڑوں

آخرت کا زادِراہ:

اس کے ساتھ ہی ظاہر سے باطن کی طرف کلام کو پھیر کر فرمایا کہ اس چھوٹے سے سفر کے لیے زادراہ کی ضرورت ہے تو اس بڑے سفر کے لیے جو سفر آخرت درپیش ہے کس قدر زادراہ کی ضرورت ہے اور وہ زادراہ تقویٰ ہے۔

255- ﴿تَبْتَغُوْا﴾ اس کا مادہ بَغِیٌّ ہے جس کے معنی میانہ روی سے آگے نکل جانے کو چاہتے ہیں۔ مگر اِبْتِغَاءٌ میں تجاوز نہیں پایا جاتا بلکہ صرف کسی چیز کے طلب کرنے کی کوشش سے یہ لفظ مخصوص ہے۔ (غ)

فَضْلٌ کے اصل معنی زِیَادَةٌ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل بغیر اکتساب بھی ملتا ہے لیکن جیسا کہ مفردات میں ہے ایک فضل وہ بھی ہے جو اکتساب سے ملتا ہے اور اِبْتِغَاءٌ کے ساتھ لانے سے یہ بتا دیا کہ وہ فضل طلب کرنے سے ملتا ہے جیسے: ﴿فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [الجمعة: 10:62] ''تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔'' یا ﴿وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [المزمل: 20:73] ''اور اَور جو زمین میں سفر کریں گے اللہ کے فضل کو تلاش کرتے ہوں گے۔'' ان تمام مقامات میں فضل سے مراد وہ مال ہے جو تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔

بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ جاہلیت میں عکاظ اور مجنہ اور ذوالمجاز میں منڈیاں لگتی تھیں۔ مسلمانوں نے خیال کیا کہ حج میں تجارت کرنا شاید منافی اغراض حج ہو۔ اس لیے فرمایا کہ اصل نیت حج ہو۔ ﴿فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ﴾ اور اس کے احکام کو بھی مدنظر رکھو تو تجارت کر لینے میں حرج نہیں۔ ابو مسلم نے کہا ہے کہ یہ اجازت حج سے فراغت کے بعد ہے۔ (ر) اگر حج روحانی ترقی کا کمال ہے تو تجارت دنیوی ترقی کا کمال ہے اور مسلمانوں کو دونوں قسم کی ترقی اپنے اندر جمع کرنی چاہیے۔ حج کے ساتھ بھی تجارت کی اجازت دے کر تجارت کی ضرورت کو بتایا۔ مسلمانوں نے اگر روحانی ترقی کی راہوں کو چھوڑا ہے تو ساتھ ہی دنیوی ترقی کی راہوں کو بھی چھوڑا ہے اور تجارت ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسری قوموں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔

256- ﴿اَفَضْتُمْ﴾ فَاضَ الْمَآءُ کے معنی ہیں پانی زور سے بہا۔ ﴿تَرٰۤی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ [المآئدة: 83:5] ''تو تُو دیکھے گا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔'' آنسوؤں کے جاری ہونے پر بولا گیا ہے اور لوگوں کے کثرت کے ساتھ ایک مقام سے آنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ گویا پانی کے بہنے کے ساتھ تشبیہ ہے۔ (غ) جیسے یہاں اور اگلی آیت میں اور اِفَاضَةٌ فِی الْحَدِیْثِ بات میں لگ جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے: ﴿لَمَسَّكُمْ فِیْ مَاۤ اَفَضْتُمْ فِیْهِ﴾ [النور: 14:24] ''تو جس بات کا تم نے

قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

یقیناً گمراہوں میں سے تھے۔(257)

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

پھر تم وہاں سے ہو کر چلو جہاں سے لوگ ہو کر چلتے ہیں اور اللہ کی حفاظت مانگو اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(258)

چرچا کیا تھا، اس کی وجہ سے۔''، ﴿هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ﴾[الأحقاف: 8:46] ''جن باتوں میں تم لگے رہتے ہو وہ انہیں خوب جانتا ہے۔''

عَرَفٰتٍ۔ عَرْفٌ سے ہے مَعْرِفَةٌ اور عرفان کسی چیز کے نشان میں تفکر اور تدبر سے اس کا پالینا ہے اور یہ علم سے زیادہ خاص ہے۔ اور مَعْرِفَةٌ کے مقابلہ میں انکار ہے اور علم کے مقابلہ میں جہل اور عرفات اس میدان کا نام ہے جہاں یوم حج یعنی نویں ذی الحج کو تمام حاجی اکٹھے ہوتے ہیں۔ جس طرح یوم عرفہ اس دن کا نام ہے کیا اسم بامسمی میدان ہے۔ کیونکہ واقعی اس میدان میں اور اس دن میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی ایک خاص معرفت حاصل ہوتی ہے اور سخت سے سخت دل بھی اللہ تعالیٰ کے حضور پگھل جاتے ہیں۔ لاکھوں انسان ایک لباس میں، ایک ہیئت میں صرف خدا کی عظمت کے نعرے لگاتے ہوئے: [لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ] (صحيح البخاری، كتاب الحج، باب التَّلْبِيَةِ: 1549) سارے فرق مراتب کو، فرق رنگ کو، فرق قومیت کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں اور نہ صرف خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں بلکہ نفس انسانی کی صحیح معرفت بھی یہاں حاصل ہوتی ہے۔ میدان عرفات مکہ سے 12 میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسی میں وہ جگہ ہے جس کو جبل رحمت کہتے ہیں جس پر کھڑا ہو کر خطیب خطبہ پڑھتا ہے۔

﴿الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ مَشْعَرٌ کے معنی ظاہری نشان ہیں اور مَشْعَرِ الحَرَامِ، مزدلفہ کا نام ہے جہاں عرفات سے واپس ہو کر رات کاٹی جاتی ہے۔ وہیں نماز مغرب وعشاء جمع کر کے اور پھر فجر کی نماز پڑھی جاتی ہے۔

257- **اسلام نے کیا انقلاب پیدا کیا:** وہ جمگھٹا جس نے صرف میلے کا رنگ اختیار کر لیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اسلام نے ایسا داخل کیا کہ ایک اللہ ہی اللہ کا نام وہاں سنا جاتا ہے۔

258- ﴿اسْتَغْفِرُوا﴾ اِسْتِغْفَارٌ کا مادہ غَفَرَ ہے جس کے معنی ہیں: [اَلْبَأْسُ مَا يَصُوْنُهُ عَنِ الدَّنَسِ]۔ (غ) اس کا پہنا دینا جو اسے میل سے (یا برائی سے یا معیوب ہونے سے) بچا رکھے اور اسی لیے کہتے ہیں: [اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِي الْوِعَاءِ] یعنی اپنے لباس کو صندوق میں محفوظ رکھ اور کہا جاتا ہے کہ کپڑے کو رنگ لو [فَإِنَّهُ أَغْفَرُ لِلْوَسَخِ] کیونکہ وہ میل سے زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے۔ (غ) پس غَفَرَ کے اصل معنی بروئے لغت محفوظ رکھنا ہیں اور استغفار کے معنی حفاظت چاہنا اور لسان العرب میں ہے کہ غَفَرَ کے معنی ہیں تَغْطِيَةٌ اور سِتْرٌ یعنی ڈھانکنا اور [غَفَرَ اللّٰهُ ذُنُوْبَهُ] کے معنی ہیں اللہ نے اس کے گناہوں کو ڈھانک

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ پھر جب تم اپنے حج کے ارکان کو پورا کرلو تو اللہ کا ذکر کرو

لیا۔ (ل) اور مِغْفَرٌ خود کو کہتے ہیں کہ وہ حفاظت کا کام دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گناہ سے حفاظت دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ ان گناہوں سے جو انسان کر چکا ہے حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی سزا سے بچ جائے مگر اس سے بڑھ کر حفاظت گناہ سے یہ ہے کہ انسان گناہ کرنے سے ہی بچ جائے۔ اس لیے غفر اور استغفار میں گناہ سے حفاظت دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے اور کہیں اس سے مراد گناہ کی سزا سے بچنا ہوتا ہے اور کہیں خود گناہ سے بچنا۔

چنانچہ قسطلانی شرح بخاری میں: [قَدْ غَفَرَ لَكَ، مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ] (صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ "أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللهِ.": 20) کی تشریح میں لفظ غَفَرَ کے معنی برماوی سے یوں نقل کیے ہیں: [اَلْغَفْرُ، اَلسِّتْرُ، وَ هُوَ مَا بَيْنَ الْعَبْدِ وَالذَّنْبِ وَإِمَّا بَيْنَ الذَّنْبِ وَالْعُقُوْبَةِ] یعنی غفر کے معنی بچانا ہیں اور وہ یا بندہ اور اس کے ذنب کے درمیان ہے یعنی بندہ کو قصوروار ہونے سے بچایا جائے اور یا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ہے یعنی جو گناہ ہو چکا ہے اس کی سزا سے بچایا جائے۔ اور غَفَّارٌ اور غَفُوْرٌ اور غَافِرٌ جو اللہ تعالیٰ کی صفت میں ہیں تو وہ بھی ان دونوں معنوں پر مشتمل ہیں اور ان کے معنی محفوظ رکھنے والا، بچانے والا اور اول الذکر دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اور نہایہ میں ان کے معنی میں لکھا ہے: [اَلسَّاتِرُ لِذُنوبِ عِبَادِهِ وَعُيُونِهِمُ الْمُتَجَاوِزُ عَنْ خَطَايَاهُمْ وَذُنُوْبِهِمْ] یعنی اپنے بندوں کے قصوروں اور عیبوں کو ڈھانک دینے والا (یعنی ان سے قصور اور عیب ظاہر نہ ہونے دینے والا) اور ان کی خطاؤں اور قصوروں سے درگزر کرنے والا۔ جہاں ساتر کے مقابلہ پر متجاوز لا کر بتا دیا ہے کہ پہلے حصہ میں ان قصوروں اور عیبوں کا ذکر ہے جو سرزد نہیں ہوئے اور خود قرآن شریف میں ہے: ﴿فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: 25:17] ''تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے۔'' اور اَوَّابٌ وہ ہے جو ہر وقت خدا کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے خدا کا غفور ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچاتا رہتا ہے اور ان میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ اور اگر غَفَرَ کے معنی عذاب کے چھونے سے بچانا بھی لیے جائیں جیسا کہ بعض اہل لغت نے لکھ دیا ہے تو عذاب کے چھونے سے بھی انسان دونوں طرح سے بچتا ہے یعنی یہ کہ وہ بات ہی اس سے سرزد نہ ہو جو عذاب لاتی ہے یا اگر سرزد ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا سے بچالے۔

خود قرآن شریف میں اس لفظ کا استعمال دونوں معنوں میں یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہے۔ اول جہاں عفو اور غفر کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔ وہاں ہمیشہ عفو کو پہلے رکھا ہے اور غفر کو پیچھے اور عفو کے معنی گناہ کو مٹانا ہیں یعنی اس کی سزا سے بچالینا۔ پس غفر کے معنی اس صورت میں سوائے گناہ سے حفاظت کے اور ہو ہی نہیں سکتے [دیکھو نمبر: 366]۔

دوسرے استغفار کا مرتبہ تمام نیکیوں میں بلند تر رکھا ہے: ﴿اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝﴾ [آل عمران: 17:3] جہاں پہلے مرتبہ پر صبر کرنے والے ہیں یعنی جو اپنے آپ کو مشکلات میں روک رکھتے ہیں۔ دوسرے پر صدق دکھانے والے تیسرے پر عاجزی کے ساتھ فرمانبرداری اختیار کرنے والے چوتھے پر اپنی قوتوں اور

كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر۔[259] پھر لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں (ہی) دے دے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

طاقتوں کو اللہ کی راہ میں لگانے والے اور سب سے اوپر صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے [دیکھو نمبر: 388]۔

تیسرے استغفار کی ضرورت جنت میں بھی بتائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ محض بلندی درجات کی دعا ہے کیونکہ جنت میں تو داخل ہی تب ہوگا جب گناہ بخشے جائیں گے۔ اس لیے جب جنتیوں کی اس دعا کا ذکر کیا ﴿رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا﴾ [التحریم: 8:66] ''اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لیے کامل کر دے اور ہماری مغفرت فرما'' تو معلوم ہوا کہ غفر اور استغفار سے یقیناً مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہنا ہے۔

امتیاز قومی کو دور کیا:

آیت کے پہلے حصہ میں جو ذکر ہے کہ ''جہاں سے لوگ لوٹیں وہاں سے لوٹو'' تو یہ بعض قوموں نے جو اپنے لیے امتیاز قائم کر رکھا تھا اس کو دور کیا ہے۔ قریش اور کنانہ جو حمس کے نام سے موسوم تھے اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرنے کے لیے میدان عرفات میں نہ جاتے تھے اور مزدلفہ سے واپس آ جاتے تھے۔ ایسے امتیازات کو دور کر کے مساوات کو قائم کیا اور حکم دیا کہ سب لوگ عرفات میں جائیں اور وہاں سے لوٹیں۔

اس کے بعد استغفار کا ذکر ہے بخاری میں اس کی تفسیر میں ہے: [وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ حَتّٰى تَرْمُوا الْجَمْرَةَ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ): 4521) گویا رمی جمار یا کنکریوں کا پھینکنا اسی استغفار کے ذکر میں ہی آ گیا اور یوں رمی جمار کی اصل حقیقت بتا دی۔ انسان میں اپنے مولیٰ کے لیے عاشقانہ حالت پیدا کرنا اور اس کی عملی تصویر کھینچ دینا تا کہ قلب پر دیرپا اثر ہو حج کی اصل غرض ہے۔ اسی لیے سب لباس اتروا کر دو چادروں کے لباس میں ملبوس کر دیا اور عزت، وجاہت، امارت، فیشن کے سارے امتیازات کو یکسر مٹا دیا۔ کنکریاں پھینکنے میں ایک مسلمان کی یہ تصویر دکھانا مقصود ہے کہ وہ بدی کے ساتھ کبھی صلح نہیں کر سکتا نہ بدی کی طاقتوں کی طرف سے لاپروا ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ان کے مقابلہ کے لیے تیار ہے اور ہر وقت ان کو اپنے آپ سے دور کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ کسی چیز کی طرف کنکر پھینکنے سے مراد ہوتی ہے کہ انسان اپنے پاس پھٹکنے نہیں دے گا اور اس کے خلاف جنگ کرے گا۔ اسی طرح ارکان حج میں دوڑنا اور تیز چلنا ہے جس میں بتایا ہے کہ ہر قسم کی ترقی روحانی ہو یا دنیوی جدوجہد سے ہے نہ حجروں میں بیٹھنے سے۔ توحید کے گھر کے گرد گھومنا کیا ہے؟ نیکیوں کے اصل مرکز کے گرد پھرتے رہنا۔ یہاں بھی استغفار کے معنی گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنا ہی ہیں۔

259- **باپ دادوں کی بڑائی کرنے سے روکا ہے:** زمانہ جاہلیت میں حج سے فارغ ہو کر میلے لگاتے اور ان میں اپنے اپنے باپ دادوں کی

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

اور کوئی ان میں سے کہتا ہے اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں (بھی) بھلائی (دے) اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔(260)

النصف

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

یہی ہیں جنہیں اس سے حصہ ملے گا جو انہوں نے کمایا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔(261)

بڑائی کا ذکر کرتے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر سکھایا جو حقیقی ترقی کی راہ ہے۔ باپ دادوں کی بڑائی کا ذکر شاہراہ مقصود میں رکاوٹ ہے اس سے روکا۔ آج مسلمانوں نے بڑا کمال اسی کو سمجھا ہوا ہے ''پدرم سلطان بود'' اپنی بڑائی کے لیے یہی کافی سمجھا ہوا ہے کہ ہم بادشاہوں اور سیدوں کی اولاد ہیں اللہ کے ذکر سے انسان ان راہوں پر چل سکتا ہے جو خود اس کو مقام عظمت پر پہنچاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرة: 152:2] ''پس مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔''

260- **دعائے جامع دین و دنیا:** اس آیت میں اور اس سے پہلی میں دو دعاؤں کا ذکر ہے۔ پہلی دعا ان لوگوں کی ہے جن کی ہمتیں دنیا تک محدود ہیں۔ خدا سے بھی کچھ مانگتے ہیں تو اس دنیا کی زندگی کے لیے ہی مانگتے ہیں۔ آج کل کی مہذب دنیا کا یہ نقشہ ہے۔ مگر مسلمان کو اللہ تعالیٰ یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم کو دین و دنیا دونوں کے کمال پر پہنچنا اپنے مدنظر رکھنا چاہیے صرف ایک کا کمال مت چاہو۔ حج کے ذکر کے ساتھ اس دعا کا لانا جو دینی اور دنیوی ترقیات کو مسلمان کے اندر جمع کرنے کی تعلیم دیتی ہے نہایت موزوں ہے۔ حج بھی کرو، تجارت بھی۔ معراج روحانی بھی حاصل کرو معراج دنیوی بھی۔

دنیا کی حسنات کی طلب:

حدیث بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعا: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ [البقرة: 201:2] ''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں (بھی) بھلائی (دے) اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔'' تھی اور امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت ﷺ اکثر کون سی دعا مانگا کرتے تھے؟ تو آپ نے یہی دعا بتائی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ایک شخص کی بیمار پرسی کو گئے اور اس کی حالت پوچھی تو اس نے کہا میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے خدا جو سزا تو مجھے آخرت میں دینے والا ہے وہ دنیا میں ہی دے لے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ یوں دعا کیا کرو: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾﴾ [البقرة: 201:2]۔

261- ﴿سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ سَرِيْعٌ سَرَعَ سے ہے اور سُرْعَةٌ ضد ہے بِطَاءٌ کی یعنی ایک کام میں تاخیر یا دیر یا سستی نہ کرنا۔ اور سَرِيْعٌ وہ ہے جو سستی یا تاخیر نہیں کرتا۔ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾ [الأنبيآء: 90:21] یعنی نیکیوں کے کرنے میں تاخیر یا سستی نہ

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳

اور گنتی کے دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی پیچھے رہے اس پر (بھی) کوئی گناہ نہیں (262) (یہ) اس کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ تم اس کے حضور اکٹھے کیے جاؤ گے۔

کرتے تھے۔ ﴿وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ [آل عمران: 133:3] ''اپنے رب کی مغفرت حاصل کرنے میں دیر نہ کرو۔'' اور حساب کے معنی مشہور ہیں اور معاملات میں حساب کو حساب اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے وہ اندازہ معلوم ہوتا ہے جس میں کفایت ہے نہ اصل مقدار پر زیادتی ہے نہ کمی۔ (ت) اسی لیے حسیب جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اس کے معنی کافی ہیں اور یہ جو فرمایا کہ اللہ سریع الحساب ہے تو اس کا جلدی حساب لینا یہی ہے کہ جو فعل انسان کرتا ہے اس کا حساب ساتھ ساتھ ہی ہوتا جاتا ہے اور اس کو ایک کا حساب لینا دوسرے کے حساب لینے سے روکتا نہیں کہ ایک کے معاملہ میں تاخیر کرنی پڑے۔ صرف یہ معنی نہیں کہ قیامت کے دن حساب لینے میں اسے بہت دیر نہ لگے گی۔ اسے دنیا میں بھی دیر نہیں لگتی۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ الٰہی محاسبہ ہر آن جاری ہے کوئی فعل نہیں مگر اس کا نتیجہ ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہاں قیامت کے دن وہ محاسبہ جو بوجہ اپنی لطافت کے یہاں نظر نہیں آتا کھلے طور پر محسوس ہونے لگے گا۔ اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے: ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝﴾ [قٓ: 22:50] یعنی نتائج تو ساتھ ساتھ ہی ظاہر ہو رہے تھے مگر اے انسان تو ان کی طرف سے غافل تھا۔ آج وہ غفلت کا پردہ ہم نے دور کر دیا اور تیری نظر تیز ہو گئی۔ ان نتائج کو اب تو دیکھ سکتا ہے۔ پس حساب تو ساتھ ساتھ ہو رہا ہے۔ وہاں اس کا رنگ نیا ظاہر ہو گا جو کھلا محسوس ہو گا اور اسی کے مطابق ہے جو فرمایا: ﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝﴾ [بني إسرائيل: 13:17] یعنی ہر ایک انسان کے عمل کو ہم نے اس کے ساتھ لگا دیا ہے اور قیامت کے دن ایک کتاب ہم اس کے لیے نکال دیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ گویا نتیجہ ہر عمل کا تو یہیں سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے ہاں قیامت میں وہ اس نتیجہ کو کھلا کھلا دیکھ لے گا۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا: ﴿كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝﴾ [بني إسرائيل: 14:17] یعنی آج کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت نہیں۔ تیرا اپنا نفس ہی تجھ پر حساب کے لیے کافی ہے۔

262- یہ ایام تشریق کی طرف اشارہ ہے جو یَوْمُ النَّحْرِ یعنی عید کے دن کے بعد تین دن ہیں۔ ہاں دو دن میں بھی کوئی چلا جائے تو حرج نہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

اور لوگوں میں سے وہ (بھی) ہے کہ جس کی بات دنیا کی زندگی میں تجھے تعجب میں ڈالتی ہے اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بناتا ہے جو اس کے دل میں ہے اور وہ جھگڑا کرنے میں بہت سخت ہے۔ (263)

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

اور جب حاکم بنتا ہے تو ملک میں کوشش کرتا ہے کہ اس میں فساد ڈالے اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ (264)

263- يُعْجِبُ۔ عَجَبٌ اور تَعَجُّبٌ اس حیرت کی حالت کا نام ہے جو انسان کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ کسی چیز کے سبب سے ناواقف ہو اور اَعْجَبَ کے اصل معنی ہیں اسے تعجب میں ڈالا اور خوش کرنا بھی آتے ہیں۔ (ت)

اَلَدّ اس جھگڑنے والے کو کہتے ہیں جو انکار میں نہایت سخت ہو۔ جمع لُدٌّ ہے ﴿وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ [مریم: 97:19] ''اور ایک جھگڑالو قوم کو اس کے ساتھ ڈرائے۔'' اور اَلَدّ گویا شَدِیْدُ اللَّدَدِ ہے۔ یعنی جس کی گردن کی دونوں طرفیں سخت ہوں یا اکڑی ہوئی۔ جس چیز کا ارادہ کر لیتا ہے اس سے پھرتا نہیں۔ (غ)

خِصَامٌ مصدر بمعنی مُخَاصَمَةٌ ہے یا خَصْمٌ کی جمع۔ جھگڑا یا لڑائی کرنے والا۔

مفسرین کہتے ہیں اس میں شریق بن اخنس کا ذکر ہے مگر قرآن شریف کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ ذکر عام ہے مفسدین کا ذکر ہے۔ اب بھی بہتیرے ایسے مفسد ہیں، بہتیرے دل میں ایک قوم کی تباہی کو مدنظر رکھ کر ان کی جڑیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی یقین دلاتے جاتے ہیں کہ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں اور یہ تجاویز تمہاری بہتری کے لیے ہیں۔ قرآن کریم کے عام الفاظ کو خاص خاص لوگوں پر محدود کرنا کلام الٰہی کی بے وقری کرنا ہے۔

اس مضمون کا تعلق پچھلے مضمون سے اس لحاظ سے ہے کہ پہلے ذکر جنگ کا تھا اور یہاں سمجھایا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ وہ باتیں تو چکنی چپڑی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا بڑا ہمدرد ظاہر کرتے ہیں لیکن دل میں ظلم اور فساد ہوتا ہے گویا اسلام کے دشمنوں کا نقشہ کھینچا ہے اور ایک یہ بھی تعلق ہے کہ ابھی حج کے احکام کا ذکر ہو رہا تھا اور حج میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ایسے ہی لوگ تھے کہ اپنے آپ کو مصلح بھی بتاتے تھے۔ مگر فی الحقیقت فساد پھیلا رہے تھے۔

264- تَوَلّٰى کے معنی ضحاک سے غَلَبَ وَصَارَ وَالِیًا مروی ہیں یعنی غالب آئے اور حاکم بنے۔ معمولی معنی پھر جانا یہاں مراد نہیں۔

حَرْثٌ۔ زمین میں بیج ڈالنے اور اس کو زراعت کے لیے تیار کرنے کو کہتے ہیں اور جو چیز اس طرح ڈالی جائے یعنی کھیتی اس کو بھی حرث کہا

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو جھوٹی شیخی اسے گناہ میں لگا دیتی ہے سو اس کے لیے دوزخ بس ہے اور یقیناً وہ بری جگہ ہے۔ (265)

جاتا ہے۔ استعارۃً یہ لفظ عورت پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح دانہ کا بقا زمین سے ہے نوع انسان کا بقا عورت سے ہے۔ بعض لوگوں نے نسل کے قرینہ کی وجہ سے یہاں عورت مراد لی ہے اور امام صادق سے منقول ہے کہ حرث سے مراد دین اور نسل سے مراد لوگ ہیں۔ مگر ظاہر معنی زیادہ قرین قیاس ہیں۔

نَسْلٌ کے اصل معنی اِنْفِصَالٌ عَنِ الشَّیْءِ کے ہیں یعنی کسی چیز سے علیحدہ ہو جانا، اسی سے تیزی سے نکل آنا بھی اس کے معنی ہیں: ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ [الأنبیآء: 96:21] ''اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے پھیل جائیں گے۔'' اور نسل اولاد کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ باپ سے نکلتی ہے۔ (غ)

پچھلی آیت کے مضمون کو مکمل کیا ہے کہ باتیں کرنے والے تو بہت ہیں اور بڑے بڑے اصول بھی نسل انسانی کی خیر خواہی کے قائم کرتے ہیں۔ لیکن جب حکومت ملتی ہے تو بجائے ہمدردی مخلوق کے خود اپنی یا اپنی قوم کی بہتری کے لیے زمین کو ویران کر دیتے اور نسل کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اسی کو فساد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ حکومت کی اصل غرض زمین کو سرسبز و شاداب بنانا اور لوگوں کی بہی خواہی کرنا ہے۔ آج کل کی مہذب قومیں لفظوں میں بڑے بڑے لمبے چوڑے اصول باندھتی ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا سچا بہی خواہ ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن جب موقعہ ملتا ہے تو دوسری قوموں کو ذلیل کرنے میں اور ان کو انسانیت کی صفات سے محروم کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر توجہ نہ کی اور حکومت کی اصل غرض کو نظر انداز کر کے اس حالت پر پہنچے کہ حکومت ان سے لے لی گئی کیونکہ وہ نفس پرست بن گئے اور قوم کی بہتری ان کی اصلی غرض نہ رہی۔ بلکہ خود عیاشی کر لینے کو حکومت کی اصل غرض سمجھ لیا۔ اور آج بھی بہتیرے ایسے ہیں کہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے بڑے بڑے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن کسی بلند مرتبہ پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اپنی ہی قوم کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔

265- عِزَّةٌ کے اصل معنی وہ حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے بچانے والی ہو۔ مگر کبھی اس کا استعمال مذموم حَمِيَّةٌ اور اَنَفَةٌ پر ہوتا ہے یعنی جھوٹی شیخی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا بغیر اس کے کہ بڑا ہو۔ (غ) یہاں یہی معنی ہیں۔

مِهَادٌ۔ مَهَدٌ اور مِهَادٌ وہ مکان ہے جو تیار کیا گیا ہے اور جس پر چلا جاتا ہے۔ (غ) اور یا یہ دونوں مصدر ہیں۔ (ت) اور مَهَدَ کے معنی ہیں تیار کیا۔

جھوٹی شیخی حصول کمال میں مانع ہے:

یہاں تو کفار کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ سچ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے جو صحیح معنی میں تقوی اللہ ہے روکنے والی چیز

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں سے وہ (بھی) ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔(266)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم سارے کے سارے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔(267)

جھوٹی شیخی اور اَنَفَۃٌ ہے۔ ناک رکھنے کے لیے بہت سے بیہودگیوں کا ارتکاب ہوتا ہے مگر آج کل اکثر مسلمانوں میں یہی جھوٹی شیخی پائی جاتی ہے۔ ذلیل ہیں مگر اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ گویا ان کے برابر عزت ہی کسی کی نہیں اور اسی جھوٹی شیخی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اخلاق انسانی کے کمال کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی بڑائی کے خیال کو دل سے نکال دے۔

266- **صحابہ رضی اللہ عنہم کا بلند مقام:** پہلے مفسد گروہ کے مقابل پر یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد قرار دے کر اپنی ساری خواہشات کو اس ایک مقصد کے سامنے قربان کر دیتے ہیں ان کو بادشاہت بھی مل جائے تو ان میں اس سے کوئی شیخی اور بڑائی پیدا نہیں ہوتی بلکہ مخلوق الٰہی پر مہربانی کرنا یہ ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ اسی کی طرف ﴿وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ [البقرة: 207:2] میں اشارہ ہے جب وہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے تو لازماً ان کا شیوہ بھی مخلوق خدا پر مہربانی ہے۔ اس آیت میں بھی کسی خاص آدمی کا ذکر نہیں؛ ہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت عامہ کا بیان کیا ہے جیسا دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ [التوبة: 111:9] ''اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں (اس کے) بدلہ میں کہ ان کے لیے جنت ہے۔'' اور پھر یہ سند بھی اس گروہ کو عطا فرمائی ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ [المجادلة: 22:58] ''اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔'' پس یہی وہ گروہ ہے جس نے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اپنی ساری خواہشات کو قربان کر دیا۔

267- سِلْمٌ کے اصل معنی صلح بھی ہیں اور اِنْقِیَادٌ وَاِسْتِسْلَامٌ بھی آتے ہیں یعنی فرمانبرداری۔ صلح میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ اور اس کا مطلب بھی فرمانبرداری ہے۔

﴿كَآفَّةً﴾ كَفٌّ سے ہے جس کے معنی ہتھیلی ہیں اور روکنا بھی اس کے معنی آتے ہیں اس لیے کہ ہاتھ سے روکا جاتا ہے اور كَافٌّ اور كَافَّةٌ (جس میں تا مبالغہ کے لیے ہے) روکنے والے کے معنی میں ہے اور جماعت کو بھی كَافَّةٌ کہا جاتا ہے یعنی سب کے سب۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

پھر اگر تم اس کے بعد جو تمہارے پاس کھلے دلائل آچکے پھسل جاؤ تو جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔(268)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع 25/14/9

وہ کسی بات کے منتظر نہیں مگر یہ کہ اللہ بادلوں کے سایوں میں اور فرشتے ان کے پاس آئیں اور معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے اور سب کام اللہ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں۔(269)

(غ) اور ایک چیز کے کل کے کل کو بھی کافہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس کے اجزاء کو پراگندہ ہونے سے روکنے والا ہے۔(ض)

اسلام میں کامل طور پر داخل ہونے کی ضرورت:

﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ سے مراد یہ ہے کہ کلی طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارے ظاہر و باطن سے کوئی چیز نہ ہو جو اسلام کے جوئے کے ماتحت نہ ہو یا یہ کہ پورے پورے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ۔ کسی قسم کا نفاق تم میں باقی نہ رہے۔ یہاں سب ایمان لانے والوں کو، سب مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ اسلام کو اپنا مذہب کہتے ہو تو پھر اس میں پورے داخل ہو یہ نہیں کہ ایک حصہ کو مان لیا اور ایک کو ترک کر دیا۔

268- یعنی اگر تمہاری ذلت سے تم کو نقصان پہنچے تو یہ مت سمجھو کہ مسلمانوں کا خدا کمزور ہے، ہاں تمہاری مصیبت بھی کسی حکمت پر مبنی ہے۔

269- هَلْ۔ حرف استخبار ہے کبھی استفہام کے لیے آتا ہے کبھی تنبیہ کے لیے یا نفی کے لیے یا دوسرے کو ملزم کرنے کے لیے۔(غ) یہاں نفی مراد ہے۔

ظُلَلٌ۔ ظُلَّةٌ کی جمع ہے اور ظُلَّةٌ وہ بادل ہے جو سایہ کرے (ظل سایہ کو کہتے ہیں) مگر اس کا اکثر استعمال ایسے موقعہ پر ہے جسے ناپسند کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں اس کا استعمال عذاب کے موقعہ پر ہی ہوا ہے: ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ [الشعرآء: 189:26] ''بادل والے دن کے عذاب نے۔''، ﴿لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ﴾ [الزمر: 16:39] ''ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے۔''، ﴿وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ﴾ [لقمان: 32:31] ''اور جب انہیں لہر سائبانوں کی طرح ڈھانک لیتی ہے۔''

بادلوں کے سائے:

اس آیت میں کلام کا رجوع پھر کفار کی طرف کیا ہے جو اسلام کی تباہی کے درپے تھے اور کہتے تھے کہ اگر اسلام سچا ہے تو ہم اس قدر مخالفت کے باوجود تباہ کیوں نہیں ہوتے؟ اور یہ بات کہ یہاں عذاب کا ذکر ہے۔ خود لفظ ظُلَلٌ کے استعمال سے ظاہر ہے۔ رہا یہ کہ اللہ کے آنے سے کیا مراد ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ہم قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورہ نحل

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ

بنی اسرائیل سے پوچھ کہ کس قدر کھلے نشان ہم نے ان کو دیئے اور جو اللہ کی نعمت کو بدل دے اس کے بعد کہ وہ

میں ہے: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ [النحل: 33:16] ''وہ سوائے اس کے اور کچھ انتظار نہیں کرتے کہ ان پر فرشتے آ جائیں یا تیرے رب کا حکم آ جائے۔ اسی طرح انہوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے۔'' اس آیت کا مضمون آیت زیر بحث سے بہت ملتا ہے صرف ﴿يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ [البقرة: 210:2] ''اللہ ان کے پاس بادلوں کے سایوں میں آئے۔'' کی بجائے الفاظ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ اختیار کیے ہیں اور یوں قرآن کریم نے اپنی تفسیر آپ کر دی ہے یعنی بادلوں کے سایوں میں آنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر کا آنا ہے۔ یعنی اس کی سزا جو وہ کفار پر وارد کرے (اور خود اس آیت میں قُضِيَ الْاَمْرُ کہہ کر بتا دیا ہے کہ مراد اللہ کے امر کا آنا ہے۔) اور ان الفاظ نے کہ ﴿كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ [النحل: 33:16] اس کی اور بھی تشریح کر دی ہے۔ اسی طرح پہلے لوگوں نے کیا کیونکہ پہلے لوگ بھی حق کی مخالفت کر کے عذاب استیصال مانگتے تھے۔ یہ مانگنا منہ سے ہو یا اپنے افعال سے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے آنے سے مراد اس کا خود آنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ آنے جانے سے پاک ہے بلکہ اس کے آنے سے مراد اس کی اس سزا کا آنا ہے جس سے کفار کی کوششیں اسلام کے خلاف نیست و نابود ہو جائیں اور مسلمان مظفر و منصور ہوں جیسے کہ سورہ الحشر میں ہے: ﴿فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا﴾ [الحشر: 2:59] ''اللہ ان کے پاس ایسی طرف سے آیا جدھر سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔'' حالانکہ وہاں ذکر سزائے استیصال کا ہے۔ جیسا کہ پہلے الفاظ سے ظاہر ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا﴾ [الحشر: 2:59] ''وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جو کافر ہیں اپنے گھروں سے پہلی جلاوطنی کے لیے نکالا۔ تم خیال نہ کرتے تھے کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ (کی سزا) سے بچا لیں گے۔ سو اللہ ان پر وہاں سے آیا جہاں سے انہیں گمان بھی نہ تھا۔'' پس یہود کے مدینہ سے نکالے جانے کو یعنی عذاب استیصال کو اور اسلام کے خلاف ان کی کوششوں کے نابود کر دینے کو اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے اور یہی مراد یہاں ہے یعنی اللہ کے آنے سے مراد اس امر الٰہی کا آنا ہے جو ان کی مخالفت کا استیصال کلی کر دے اور ترکیب میں یا مضاف حذف ہے جیسا کہ اکثر کلام میں آیا ہے اور مراد يَأْتِيَهُمْ اَمْرُ اللّٰهِ ہے اور یا مفعول محذوف ہے اور مراد ہے: [يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ بِمَا وَعَدَهُمْ بِهِ] یعنی اللہ ان پر وہ چیز لائے جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔

ملائکہ کے آنے سے مراد بھی کفار پر عذاب کا آنا اور مومنوں کی نصرت ہی ہے۔ سورہ فرقان میں ہے: ﴿يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ﴾ [الفرقان: 22:25] ''جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہو گی۔'' یعنی فرشتوں کا آنا تو مجرموں کی سزا کے لیے ہی ہوا کرتا ہے اور قرآن کریم میں ان تینوں جنگوں میں جن میں قریش کا مقابلہ رسول اللہ ﷺ سے ہوا ہے، ملائکہ کے آنے کا ذکر ہے جس میں یہی اشارہ ہے [دیکھو نمبر: 511]۔ اور ملائکہ کے آنے کی غرض

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

اس کے پاس آ گئی تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔(270)

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ

وقف لازم

جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی آراستہ کی گئی ہے اور وہ ان سے ہنسی کرتے ہیں جو ایمان لائے اور جو تقویٰ

کیا تھی؟ اس کے لیے دیکھو نمبر 512۔ پس ملائکہ کے آنے سے مراد کسی قدر ان کو سزا کا مل جانا یا ان کی تھوڑی مغلوبیت ہے۔ اور اللہ کے آنے سے مراد ان کی مخالفت کا آخری استیصال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تینوں جنگوں میں یعنی بدر، احد، احزاب میں نزول ملائکہ کا ذکر ہے۔ جب دشمن مسلمانوں پر چڑھ کر آیا مگر فتح مکہ کو جس میں نبی کریم ﷺ خود مکہ پر چڑھ کر گئے اور کفار کی مخالفت کا پورا استیصال کیا گویا اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے؛ کیونکہ اس میں اسلام کا کامل غلبہ دکھایا گیا اور کفر کی طاقت ملک عرب میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ ان باتوں کو جنگوں کے نام سے ظاہر نہیں کیا اس لیے کہ اگر اسلام کا غلبہ ایک وقت جنگ سے مقدر تھا تو دوسرے وقت دوسری راہوں سے ہوسکتا ہے اور امر اللہ میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔

﴿وَ قُضِيَ الْاَمْرُ﴾ کے یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ معاملہ کا فیصلہ ہوجائے۔ اور یوں بھی کہ وہ انتظار کرتے ہیں حالانکہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو ہو چکا ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔ دوسرے معنی زیادہ موزوں ہیں اور اس میں گویا اسلام کے آخری غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کی کھلی پیشگوئی ہے۔

270- سَلْ میں ہر ایک مخاطب مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ضرور ہر شخص سوال کرے بلکہ خود بنی اسرائیل کو اور ضمناً سب کو جتانا مقصود ہے کہ وہ غور کریں کتنے نشان ان کو دیئے گئے۔

﴿اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ﴾ یہ کھلے نشان کیا تھے؟ اول وہ کھلی پیشگوئیاں جو آنحضرت ﷺ کے ظہور کے متعلق ان کی کتابوں میں تھیں اور جو خود ان میں مشہور چلی آتی تھیں۔ دوسرے نبی کریم ﷺ کی صداقت کے نشان جو وہ خود دیکھ سکتے تھے کیونکہ یہ اہل کتاب تھے اور سنت انبیاء سے واقف تھے۔

﴿يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ﴾ اللہ کی نعمت اسلام ہے۔ (ج) اس کی تبدیلی سے مراد اس کا انکار ہے۔ اس انکار کا نام تبدیلی اس لیے رکھا کہ بنی اسرائیل نے پہلے جس بات کو عقیدتاً قبول کیا ہوا تھا یعنی نبی آخرالزمان کا آنا، اب اس کا سرے سے انکار کر دیا۔ آج مسلمانوں نے بھی اس اللہ کی نعمت کو تبدیل کر رکھا ہے۔ منہ سے اقرار اور عمل سے انکار۔

پچھلے رکوع کے آخر پر ذکر تھا کہ مخالف نشان استیصال مانگتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم جو اس کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تباہ کیوں نہیں ہوتے؟ اس لیے اس رکوع کی ابتدا اس آیت سے کی کہ نشانات صداقت تو بہتیرے ظاہر ہو چکے ہیں ان کو کیوں قبول نہیں کرتے اور اپنی تباہی کیوں چاہتے ہیں؟

اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

کرتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن ان سے اوپر ہوں گے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔(271)

271- زُيِّنَ۔ زَانَ یَزِیْنُ۔ ایک چیز کے حسن کو ظاہر یا نمایاں کرنے کو کہتے ہیں، قول سے ہو یا فعل سے۔ (غ) فعل کے مجہول لانے سے یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ ان لوگوں کو یہ چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور اسی کی طرف ان کے دل کھچے چلے جاتے ہیں۔ اس سے اوپر نہیں اٹھتے۔ کون اچھی کر کے دکھاتا ہے؟ ان کی اپنی گری ہوئی خواہشات اور پست خیالات۔ قرآن کریم میں اچھی چیزوں کی زینت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسے: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ [الحجرات: 7:49] ''لیکن اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو محبوب کر دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دی ہے۔'' اور بری باتوں کے زینت دینے کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے: ﴿وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الأنعام: 43:6] ''اور شیطان نے اسے ان کے لیے خوبصورت کر دکھایا جو وہ کرتے تھے۔''، ﴿زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ﴾ [الأنعام: 137:6] ''بہت سے مشرکین کے لیے ان کی اولاد کا قتل کرنا ان کے شریک اچھا کر دکھاتے ہیں۔''

يَسْخَرُوْنَ۔ سَخِرَ کے معنی کسی پر ہنسنا اور اس کو اپنے ماتحت کر لینا یا اپنے کاموں میں لگا لینا دونوں آتے ہیں۔ کافروں کا مومنوں پر ہنسنا تحقیر کے رنگ میں تھا اس لیے کہ انہوں نے دین کی خاطر دنیوی عزت، مال، جائدادیں سب کچھ چھوڑ دیا تھا جن کی نظر میں دنیا کا مال و متاع ہی سب کچھ ہو وہ ایک قوم کو غربت کی حالت میں دیکھ کر کہاں ان کی عزت کر سکتے ہیں۔ اس لیے بھی ہنستے ہوں گے کہ مومنوں کے ساتھ بڑی بڑی فتوحات کے وعدے تھے اور یہاں حالت دگرگوں نظر آتی تھی۔ آخری الفاظ میں پھر فرمایا کہ ہم اس قدر اموال و فتوحات سے ان کو متمتع کریں گے جس کو یہ حساب میں بھی نہیں لا سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ عرب جن کے ہاں ایک ہزار سے آگے گنتی نہ تھی۔ ان میں سے ایک ایک لاکھوں اور کروڑوں کا مالک ہو گیا۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ اس بڑے دن جب سب حقائق آشکارا ہو جائیں گے معلوم ہو گا کہ فوقیت مال دنیا سے نہیں بلکہ تقویٰ سے یعنی رعایت حقوق الٰہی و حقوق العباد سے ہے صحیح اصول پر چلنے سے ہے۔ حق و انصاف کی پیروی کرنے سے ہے۔ قرآن شریف محض دنیا کی زندگی کو اور اس دنیا کی چیزوں کو برا نہیں کہتا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ﴾ [الأعراف: 32:7] زینت کے سامان جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں ان کو کس نے حرام کیا؟ ہاں جب دنیا کی زندگی ہی غایت مقصد بنا لی جاتی ہے اور خورد و نوش کو ہی زندگی کی اصل غرض سمجھ لیا جاتا ہے تو یہ وہ دنیا کی زندگی ہے جس کی مذمت کلام الٰہی کرتا ہے۔ جن لوگوں کو دنیا کی زندگی یہاں تک پیاری معلوم ہوتی ہے کہ حق اور انصاف کی پیروی کرنے والوں پر وہ محض ان کی غربت کی وجہ سے ہنسنے لگتے ہیں وہ اصل مقصد زندگی سے بہت دور نکل گئے۔ اس لیے بتایا کہ حقیقی فوقیت اخلاق فاضلہ کے حاصل کرنے سے ہے، نہ مال دنیا سے۔ آج عیسائی اقوام اسی غلطی میں پڑ کر مسلمانوں کے ہاتھ سے ہر قسم کے سامان دنیا کو چھیننے پر تلی ہوئی ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اخلاق قرآنی اپنے اندر پیدا کر لیں تو اس دنیا میں بھی اپنی فوقیت کا مشاہدہ کر لیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں۔ پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اور جنہیں وہ (کتاب) دی گئی تھی، انہی نے آپس کی ضد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں۔ پس اللہ نے اپنے حکم سے ان کو جو ایمان لائے اس حق کی طرف ہدایت دی جس میں (لوگ) اختلاف کرتے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (272)

272- كَانَ کا استعمال کئی طرح پر ہے۔ گزرے ہوئے زمانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کے بیان میں ازلیت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے ﴿كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ [فتح: 26:48] ''اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔'' اور جب کسی شے کی جنس میں اس کے وصف کے متعلق استعمال کیا جائے جو اس میں موجود ہو تو یہ ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ وہ وصف اس میں لازم ہے جیسے: ﴿كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: 67:17] ''اور انسان ناشکر گزار ہے۔'' ﴿كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ [الكهف: 54:18] جن کے معنی یوں ہوں گے انسان ناشکر گزار ہے۔ انسان اکثر جھگڑالو ہے۔ (غ) اسی طرح ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ [آل عمران: 110:3] میں حال کے معنی مراد ہیں یعنی تم بہترین امت ہو یہی معنی یہاں مراد ہیں۔

يَحْكُمُ۔ حَكَمَ کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لیے روکنا اور کسی چیز پر حکم کے معنی یہ ہیں کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ یہ چیز یوں ہے یوں نہیں۔ خواہ دوسرے پر ایسا فیصلہ لازم کیا جائے یا نہ۔ (غ)

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا عامہ قانون:

اس آیت کا مطلب بعض نے یوں بیان کیا ہے کہ پہلے سب لوگ نیک تھے پھر ان میں اختلاف شروع ہوئے جن کے مٹانے کو نبی آئے اور بعض نے یوں کہ پہلے سب گمراہی پر جمع تھے تب اللہ تعالیٰ نے نبی بھیج کر نیکوں کو بدوں سے الگ کر دیا۔ مگر یہ دونوں باتیں قرآن شریف کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ رشد و ہدایت کا جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے آدم کے ساتھ ہی شروع ہونا صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ كَانَ کے وہ معنی لے کر جو اوپر بیان ہوئے اس آیت کے معنی

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا	کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور
يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ	ابھی تمہیں ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے
مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى	پہلے گزر چکے ان کو سختی اور دکھ پہنچے اور خوب ہلائے گئے

بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ان سے یکساں ہی معاملہ ہوتا رہا۔ یعنی ان سب میں اللہ تعالیٰ نبی بھیجتا رہا۔ یہ نہیں کہ بعض قوموں کو محروم رکھا اور ایک کو نبی بھیجنے کے لیے خاص کر لیا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل سمجھتے تھے اور فرمایا کہ سب نبی ہی حق کے پیروؤں کو کامیابی کی بشارت دینے والے اور حق کے مخالفوں کو ناکامی اور دکھ کے انجام سے ڈرانے والے تھے اور ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی دی تھی تا کہ وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے باہمی اختلافوں کا فیصلہ کرے۔ بایں نبیوں کے آنے کے بعد پھر لوگوں نے باہم اختلاف کیا۔ اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو صحیح راہ کی ہدایت دی گئی اور ایک عظیم الشان حق کا قائم کرنا ان کے سپرد کیا گیا۔ اس مطلب کی صحیح حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو اٹھتے تو ان الفاظ میں دعا کرتے: [اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اهْدِنِي لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ] (مسند أحمد، جلد42، صفحہ 127) ''اے اللہ! جبریل اور میکائیل اور اسرافیل کے رب، آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، ان دیکھے اور ظاہر کے جاننے والے، تو ہی اپنے بندوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ تو مجھے اپنے اذن سے اس بارہ میں ہدایت فرما۔ جو حق کے متعلق اختلاف کیا گیا ہے بے شک تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت فرماتا ہے۔'' آیت اور حدیث کے پچھلے حصہ کے الفاظ بہت ملتے جلتے ہیں اور اسی سے یہ پتہ لگتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو گویا ان الفاظ قرآنی کا اپنے آپ کو اور اپنی امت کو مصداق قرار دے رہے ہیں۔ پس آیت کے معنی یوں ہوئے کہ نبی سب قوموں میں آتے رہے تا اختلاف کو دور کریں پھر ان کے پیروؤں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو ان اختلافوں کے مٹانے کے لیے بھیجا اس لیے ان کی مخالفت تم کیوں کرتے ہو؟

ایک اور امر جس پر یہ آیت قطعی شہادت دیتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک نبی کو خوشخبری دینے والا بھی بنایا ڈرانے والا بھی اور ہر ایک نبی کے ساتھ کتاب بھی اتاری۔ پس بغیر کتاب کے کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ جس طرح بغیر بشارت و انذار کے نہیں ہو سکتا۔ اور ﴿ اَنْزَلَ مَعَهُمُ ﴾ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہر نبی کے ساتھ ایک کتاب نازل ہوتی ہے اور یہ بھی یہی آیت فیصلہ کرتی ہے کہ ہر نبی صاحب حکم ہوتا ہے یعنی تمام اختلافات میں وہ خود اپنی وحی سے جو اس کی کتاب کہلاتی ہے فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا ﴿ لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [النسآء: 64:4] ''اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' یعنی وہ مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا۔

يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ سنو اللہ کی نصرت قریب ہے۔ (273)

273- مَثَل کے معنی نمبر 30 میں بیان ہو چکے ہیں مگر کبھی مراد اس سے کسی چیز کا وصف ہوتا ہے۔ (غ) یہی معنی یہاں مراد ہیں یعنی حالت۔

زُلْزِلُوْا۔ زِلْزَالٌ کے اصل معنی سخت حرکت دینا ہیں اور مراد مصائب کا آنا ہے۔ (ت) لسان العرب میں [أَصَابَتِ الْقَوْمَ زَلْزَلَةٌ] (لفظی معنی قوم پر زلزلہ آیا) کے معنی تخویف وتحذیر کا آنا لکھے ہیں اور تاج العروس میں زَلَازِلُ کے معنی بَلَاءٌ یا شَدَائِدُ، أَهْوَالٌ لکھے ہیں۔ یعنی بلائیں، مصیبتیں، خوفناک حالات۔ حدیث میں ہے: [اَللّٰهُمَّ اهْزِمِ الْأَحْزَابَ. اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ] (صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب الدُّعَاءِ عَلَى الْمُشْرِكِينَ بِالْهَزِيمَةِ وَالزَّلْزَلَةِ: 2933) جہاں زَلْزِلْهُمْ کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں کہ ان کے امر کو گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت میں اور ناقابل قیام کردے۔ خود قرآن کریم میں جنگ احزاب کے ذکر میں ہے: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾﴾ [الأحزاب: 11:33] ''وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت مصائب میں ڈالے گئے۔'' پس زلزلہ سے مراد یہاں شدائد وتکالیف کا آنا ہی ہے بالخصوص وہ شدائد جو جنگوں میں پیش آتی ہیں۔

حق کے قیام میں مشکلات:

جب یہ بتایا کہ کتنا بڑا کام تم مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے کل دنیا کے اختلافات کو دور کرو۔ تو یہ بھی بیان کر دیا کہ حق کا دنیا میں قائم کرنا کس قدر مشکل کام ہے اور کس قدر دکھوں کا سامنا ہے۔ چھوٹے پیمانہ پر حق قائم کرنے کے لیے بھی کیا کیا مصائب اٹھانے پڑے، تو اب اس عظیم الشان امر کے قیام کے لیے کن کن تکالیف کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مصائب ہی کامیابی کی کنجی ہے ان میں پڑنے کے بغیر انسان پختہ نہیں ہوتا تو جنت میں کس طرح جا سکتا ہے؟ سوال تھا جنت میں داخل ہونے کے متعلق اور جواب میں فرمایا کہ اللہ کی نصرت قریب ہے۔ پس مومنوں کے لیے جب خدا کی نصرت آتی ہے اور ان کو کامیاب کر کے منزل مقصود پر پہنچاتی ہے تو وہ بھی ان کے لیے ایک جنت ہی ہے۔ اس آیت میں صاف اشارہ جنگوں کی طرف ہے۔

یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ کی نصرت اسی کا نام ہے جب اسباب سے مایوسی ہو جائے اور چاروں طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آئے اور دشمن کا غلبہ بڑھتا چلا جائے یہاں تک کہ وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں بول اٹھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی۔ تب نصرت الٰہی آتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے اور جو بات اَن ہونی معلوم ہوتی تھی وہ ہو جاتی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ اور قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے اور جو کچھ بھی تم نیکی کرو گے تو اللہ اسے جانتا ہے۔ (274)

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع 26 6 10

تم پر جنگ کرنی لکھی گئی اور وہ تم کو ناگوار ہے اور ہوسکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز ناگوار ہو حالانکہ وہ تمہارے لیے اچھی ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (275)

274- خیر کے معنی مال کثیر [نمبر: 220] میں بیان ہو چکے۔ مگر خیر اس مال کو بھی کہتے ہیں جو محمود طریق پر جمع کیا گیا ہو۔ (غ)

جب حق کی خاطر دکھ تکلیفیں اٹھانے کا ذکر کیا اور جنگوں کی طرف اشارہ کیا تو ساتھ ہی انفاق یعنی مال خرچ کرنے کی ضرورت بھی بتائی اور پہلے حصہ آیت میں مال خرچ کرنے کا ذکر کرکے اور دوسرے میں نیکی کرنے کا ذکر کرکے یہی بتایا ہے کہ اپنے قویٰ کو اچھے موقعہ پر لگانا بھی انفاق میں ہی داخل ہے۔ کیا خرچ کریں؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جو کچھ بھی خرچ کرو وہ ماں باپ وغیرہ کے لیے ہی ہے۔ گویا فرمایا کہ جو کچھ خرچ کر سکتے ہو کرو۔ آخر یہ خرچ کرنا تمہارے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی ہے۔ یا تو یوں کہ انفاق کا پہلا مصرف والدین اور قریبیوں یتیموں وغیرہ کی خبر گیری ہی ہے اور یا یوں کہ تمہارے بہت سے قریبی اور بہت سے ضعیف لوگ تمہارے جہاد پر مال خرچ کرنے سے مصائب سے باہر نکل آئیں گے۔ کیونکہ جو مسلمان بھاگ آئے تھے ان کے عزیز و اقربا ابھی مکہ میں کافروں کے تسلط میں ہی تھے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کرکے کہ ''کیا خرچ کریں؟'' کا کوئی جواب یہاں نہیں۔ مَاذَا کے معنی کَیْفَ کیے ہیں یعنی کس طرح خرچ کریں؟ مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے جواب موجود ہے اور [آیت: 219] میں اسی کی وضاحت ہے۔ یا مکرر سوال کی یعنی ایک یہاں اور ایک [آیت: 219] میں۔ یہ غرض ہے کہ یہاں اقربا اور یتامیٰ پر خرچ کرنے کا ذکر ہے وہاں دشمن کے مقابل پر۔

275- کُرْہٌ کے معنی مشقت ہیں یا وہ مشقت جو انسان کو خارج سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے ہی پہنچتی ہے۔ یعنی ایک چیز کا ناگوار خاطر ہونا اور کَرْہٌ وہ مشقت ہے جو خارج کی طرف سے پہنچتی ہے۔ (غ) اور کَرِھْتَ کا استعمال دونوں معنی پر ہوتا ہے مگر کُرْہٌ پر زیادہ ہے۔ (غ)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۙ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا يَزَالُوْنَ

تجھ سے حرمت والے مہینہ کی نسبت پوچھتے ہیں (یعنی) اس میں لڑائی کی نسبت۔ کہہ دے، اس میں جنگ کرنی بہت بری ہے۔ اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے لوگوں کا اس سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی برا ہے۔ اور فتنہ قتل سے بڑھ کر برا ہے۔[276] اور وہ تم سے ہمیشہ

مسلمان جنگ کو ناپسند کرتے تھے:

لطیف اشارہ سے صراحت کی طرف انتقال کیا اور فرمایا کہ دشمنان دین اس قدر حق کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں کہ تم کو چار و ناچار حق کی حفاظت کے لیے جنگ کرنی پڑے گی۔ مگر وہ کیسی جنگ ہے؟ وہ تمہارے لیے مشقت ہے۔ وہ تم کو ناگوار ہے۔ تم اسے پسند نہیں کرتے۔ وجہ ظاہر ہے، چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمن کے ساتھ ایک مٹھی بھر مسلمان کیونکر جنگ کر سکتے تھے۔ پھر بے سروسامانی کمال کی اور بالمقابل قوم وہ جس کا پیشہ ہی جنگ کرنا چلا آیا ہے۔ پھر اصل غرض تو توحید الٰہی کا پھیلانا تھی یہ درمیان میں ایک نئی بات پیش آ گئی اس لیے ناپسند تھی۔ اسلام پر یہ الزام دینے والے کہ لُوٹ کی خاطر جنگ کی، غور کریں کہ قرآن شریف کیسے صاف الفاظ میں ان کی تردید کرتا ہے۔ لوٹ مار کرنے والوں کے لیے تو جنگ کا حکم خوشی کا موجب ہوتا نہ ایک امر ناگوار۔

موجودہ حالت اور جنگ:

ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایک وقت ایک چیز تم کو ناگوار ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی اسی میں ہوتی ہے۔ ایک بات کو تم پسند کرتے ہو وہ آخر کار نقصان کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان دو فقروں میں یہ اشارہ ہو کہ اس وقت تم جنگ کو ناپسند کرتے ہو مگر تمہاری بھلائی جنگ کرنے میں ہے کیونکہ اس کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایک وقت آئے گا کہ تم جنگ کو پسند کرو گے اس وقت وہ تمہارے لیے نقصان کا موجب ہوگی یہ دوسری حالت آج مسلمانوں پر ہے۔ واقعات یہی بتاتے ہیں کہ ہر جگہ جنگوں میں مسلمانوں کا قدم پیچھے ہٹا ہے۔

276- كَبِيْرٌ۔ اصل معنی صرف بڑا ہیں مگر بڑائی کے بڑا ہونے پر یہ لفظ خصوصیت سے بولا گیا ہے جیسے: ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً﴾ [الكهف: 5:18] ''بڑی بات ہے۔'' میں اسی لحاظ سے كَبِيْرَةٌ بہت بڑے گناہ کو کہتے ہیں۔ (غ)

صَدٌّ کے معنی دونوں آتے ہیں یعنی پھرنا اور رک جانا یا دوسرے کو پھیرنا اور روک دینا۔

يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین
دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ سے لوٹا دیں اگر انہیں طاقت ہو(277) اور جو شخص تم میں

حرمت کے مہینوں میں جنگ اور کفار کی مسلمانوں پر زیادتی:

پچھلی آیت میں جنگ کے مسلمانوں پر فرض کرنے کا ذکر کیا تو یہاں چار حرمت والے مہینوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان میں جنگ ممنوع ہے اور جب یہ بتایا کہ اسلام اس حرمت کا پاس کرتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کافر جن کی طرف سے یہاں سوال ہوتا ہے خود سب حرمت والی چیزوں کی بے حرمتی کر چکے ہیں۔ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکا، مسجد حرام سے روکا بلکہ آخر کار مسلمانوں کو مسجد حرام سے نکال دیا۔ حالانکہ مسجد حرام کی حدود میں ان کے ہاں امن کا دیا جانا ایک مسلم امر تھا۔ پھر ان سب باتوں کو لفظ فِتْنَةٌ سے تعبیر کیا ہے۔ جب فرمایا کہ فِتْنَةٌ قتل سے برا ہے۔ اس سے فتنہ کے معنی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ قرآن شریف میں کم سے کم چار اور موقعوں پر یہ لفظ صراحت سے ان دکھوں اور تکلیفوں پر استعمال ہوا ہے جو مسلمانوں کو دین اسلام اختیار کرنے کی وجہ سے دی جاتی تھیں۔ [العنکبوت: 2:29, 10]، [النسآء: 101:4]، [البروج: 10:85]۔

کفار کا اعتراض عبداللہ بن جحش کے ابن حضرمی کو قتل کرنے پر تھا۔ ہجرت کے دوسرے سال میں جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کے رنگ میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو چند آدمیوں کے ساتھ قریش کی خبر لانے کے لیے بھیجا تھا اور جو ہدایت ان کو دی تھی اس میں صاف اسی قدر ذکر تھا کہ ان کی خبر لاؤ۔ اتفاق سے ان لوگوں نے تین قریش کے آدمیوں کو دیکھا اور ان پر حملہ کیا ان میں سے ایک یعنی عبداللہ ابن الحضرمی قتل ہوا دو قید ہوئے۔ یہ جمادی الثانی کا آخری دن تھا اور یہ امر مشتبہ رہا کہ آیا رجب کا چاند دیکھنے کے بعد انہوں نے حملہ کیا یا پہلے۔ مگر خود عبداللہ بن جحش کا رضی اللہ عنہ بیان ہے کہ ہم نے ابن حضرمی کے قتل کے بعد رجب کا چاند دیکھا۔ [إِنَّا قَتَلْنَا ابْنَ الْحَضْرَمِيِّ ثُمَّ مَشَيْنَا فَنَظَرْنَا إِلٰى هِلَالِ رَجَبَ فَلَا نَدْرِيْ أَفِيْ رَجَبَ أَصَبْنَاهُ أَمْ فِيْ جُمَادٰى] پس اس واقعہ سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کا جائز ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے حرمت کے مہینوں میں حرمت قتال کا حکم قائم ہے اور منسوخ نہیں ہوا۔ چنانچہ جب ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت ﷺ حج کی نیت سے نکلے تو ہتھیار ساتھ لے کر نہیں نکلے۔ ہاں جب کفار کی طرف سے تیاری دیکھی تو اس وقت مجبوراً تیاری کی۔ ایسا ہی ایک اور موقعہ پر بھی آپ سے ثابت ہے کہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کو روک دیا۔

277- يَرُدُّوا۔ رَدٌّ کے معنی کسی چیز کا اپنی ذات میں پھیرنا یا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا آتے ہیں۔ (غ)

اِسْتَطَاعُوا۔ طَوْعٌ سے ہے جس کے معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری ہیں اور استطاعت میں نیت اور تصور فعل اور مادہ قابلہ اور آلہ کار کا ہونا ضروری ہے۔ (غ) ﴿اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾ ''اگر طاقت رکھتے ہو'' سے یہاں یہ مراد ہے کہ باقی چیزیں تو موجود ہیں اور وہ اپنا زور لگا رہے ہیں مگر مادہ قابلہ نہیں یعنی مسلمان اپنے دین کو کبھی چھوڑ نہیں سکتے۔ معلوم ہوا کہ کافر مسلمانوں کے ساتھ اس لیے

مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ سے اپنے دین سے پھرے پھر مرجائے[278] حالانکہ وہ
فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ کافر ہی ہو۔ سو یہی ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں کام

جنگ کرتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے پھیر دیں۔ پہلے تکلیفیں دیں، پھر گھروں سے نکالا، آخر تلوار لے کر کھڑے ہو گئے کہ اس کے زور سے مسلمانوں کو دین سے پھیر دیں گے۔ کس قدر خلاف واقعہ اتہام ہے کہ مسلمان کافروں کو مسلمان بنانے کے لیے جنگ کرتے تھے۔ جس قدر صبر مسلمانوں نے جنگ سے رکنے میں دکھایا ہے اگر آج اس کا دسواں حصہ بھی مہذب قوموں میں ہوتو دنیا میں امن اور آشتی پھیل جائے۔ مسلمانوں نے جنگ اس لیے کی کہ ان کو دین اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ نہ اس لیے کہ وہ دوسروں کو ان کے دین سے پھیرنا چاہتے تھے۔

278- يَرْتَدِدْ۔ اِرْتِدَادٌ کے اصل معنی ہیں اس طریق پر لوٹ جانا جس سے ایک شخص آیا تھا۔ جیسے: ﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ [الكهف: 64:18] ''سو وہ دونوں اپنے (پاؤں کے) نشانوں کا پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے۔'' میں۔ اور اسلام سے کفر کی طرف لوٹ جانے اور اسلام کو چھوڑ کر کفر میں داخل ہونے پر بالخصوص یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور رِدَّةٌ صرف اسی معنی کے لیے خاص ہے۔ (غ)

ہر مرتد کا حکم قتل نہیں:

یہاں مرتد کے حالت کفر پر مرنے کا ذکر ہے نہ اس کے قتل کرنے کا۔ سورہ مائدہ کی آیت 54 میں بھی مرتد کا ذکر ہے مگر وہاں بھی اس کو قتل کرنے کا حکم نہیں نہ قرآن کریم میں کسی دوسری جگہ قتل مرتد کا حکم ہے۔ احادیث میں صرف ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب بعض زنادیق کو جلایا گیا تو یہ فرمایا کہ ان کو قتل کرنا چاہیے تھا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: [مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ] (صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب لَا يُعَذَّبُ بِعَذَابِ اللهِ: 3017) ''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کردو۔'' اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں جو عمومیت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کی رو سے کوئی شخص کوئی سا ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے اسے قتل کرنا چاہیے۔ مثلاً یہودی عیسائی ہوجائے یا عیسائی مسلمان ہوجائے تو واجب القتل ہوگا۔ مگر یہ بالبداہت باطل ہے اس لیے حدیث کے الفاظ کو مقید کرنا پڑے گا اور چونکہ اس کے راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جو سن شعور کو اس وقت پہنچے جب لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اسلام کو چھوڑ کر ساتھ ہی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ جا ملتے تھے اور ان کا قتل ضروری تھا۔ چنانچہ اس قید کی تحدید اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ عورتیں جنگ میں حصہ نہ لیتی تھیں اور نبی کریم ﷺ نے اسی بنا پر ان کے قتل کرنے کی ممانعت کر دی تھی اور عکل کی سزا والی حدیث سے بھی مرتد کے قتل کا حکم اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے پاس اسلام کا اظہار کر کے بعد میں بیماری کا عذر کیا تو آپ نے ان کو وہاں باہر رہنے کی اجازت دی جہاں بیت المال کے اونٹ تھے تاکہ کھلی ہوا میں رہنے سے صحت ہو اور دودھ پئیں۔ مگر انہوں نے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ لے کر چلتے بنے۔ پس ان کی

الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

نہ آئے۔[279] اور یہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

سزا اس قتل اور ڈاکہ کی وجہ سے تھی نہ ارتداد کی وجہ سے۔ علاوہ ازیں اگر مدینہ میں کسی مرتد کو واجب القتل قرار دیا گیا ہو تو اس وجہ سے کہ جو شخص اس وقت اسلام کو ترک کرتا وہ دشمن سے جاملتا جو اس وقت اسلام کی تباہی پر تلا ہوا تھا۔ گویا مسلمان اس وقت میدان جنگ میں ایک فوج کی صورت میں پڑے تھے اور ایک حدیث میں صاف لفظ ہیں کہ صحابہ نے شکایت کی کہ ہم کو دن رات ہتھیار باندھ کر رہنا پڑتا ہے۔ پس اس وقت ارتداد کے معنی دشمن کے ساتھ جاملنا تھا اور جو شخص اپنی فوج کو چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جاملتا ہے وہ آج بھی واجب القتل ہی سمجھا جاتا ہے۔ صلح کے وقت واجب القتل قرار نہ دینا خود اس سے ظاہر ہے کہ صلح حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ نے یہ شرط قبول کی تھی کہ کوئی مسلمان کفار کے ساتھ جاملے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔ اگر قرآن میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو آپ اس کے خلاف شرط کبھی قبول نہ کرتے۔ پس [مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ] (صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب لاَ يُعَذَّبُ بِعَذَابِ اللهِ: 3017) بھی انہی واقعات سے مخصوص معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی کی عمومیت کو کوئی شخص بھی قبول نہیں کرسکتا۔

ہر مرتد کا نکاح فسخ نہیں ہوتا:

پس مرتد کے لیے سزائے قتل از روئے قرآن وحدیث صحیح نہیں اور جس طرح وہ صحیح نہیں اسی طرح وہ احکام جو فقہاء نے اس پر متفرع کیے ہیں وہ بھی آج ان حالات میں جب مسلمان غیر مسلم سلطنتوں کے ماتحت ہیں درست نہیں۔ مثلاً یہ کہ مرتد کے سارے حقوق زائل ہوجاتے ہیں۔ پھر اس پر یہ حکم متفرع کیا گیا ہے کہ اس کا نکاح بھی باقی نہیں رہتا۔ اب انگریزی عدالتوں نے باقی فتویٰ کو تو حالات ملکی کے لحاظ سے قبول نہیں کیا۔ یعنی مرتد کے حقوق کو زائل نہیں کیا مگر نکاح فسخ ہوجانے کو اس فتویٰ کی بنا پر مان لیا ہے۔ حالانکہ حالات ملکی کے لحاظ سے دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا سارا فتویٰ مانا جائے یا سارا چھوڑا جائے اور چونکہ پہلی صورت پر عمل نہیں ہوسکتا دوسری اختیار کرنی چاہیے۔ مگر ہمارے علماء کی حالت بھی عجیب ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح محض طلاق حاصل کرنے کے لیے آئے دن مسلمان عورتیں عیسائی ہوجاتی ہیں اور خاموش ہیں۔ کیونکہ فقہاء کا فتویٰ ایسا ہی ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ فقہاء کا فتویٰ تو ہندوستان میں ناممکن العمل ہے پھر اس کے ایک جزو پر جس سے قوم کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے عمل کے کیا معنی ہوئے۔ قرآن وحدیث میں کوئی حکم نہیں کہ مرتد کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ فقہاء کا فتویٰ ہے۔ لیکن اس کی اصل کو انگریزی عدالتیں قبول نہیں کرتیں یعنی مرتد کے حقوق کو زائل قرار نہیں دیتیں۔ پھر اسی کی فرع کو کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے قبول کرنا محض مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ کیا علماء کا یہ فرض نہیں کہ جب اصل کو قابل قبول نہیں سمجھا گیا تو فرع پر عمل کے خلاف آواز بلند کریں۔ عامہ حالات میں ظاہر ہے کہ اگر عورت عیسائی ہوجائے تو نکاح نہیں ٹوٹتا کیونکہ عیسائی عورت کا نکاح مسلمان مرد سے جائز ہے لیکن مرد عیسائی ہوجائے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ مسلمان عورت کا نکاح عیسائی مرد سے جائز نہیں۔

279- حَبِطَتْ۔ حَبَطَ کے اصل معنی ہیں کہ جانور بہت سا کھالے یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جائے۔ (غ) گویا اس کا کھایا ہوا کام

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(280)

نہ آیا۔ پس حبط عمل سے مراد عمل کا بے نتیجہ رہنا یا کام نہ آنا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں حبط عمل تین طرح پر ہے۔

اول یہ کہ دنیوی کام ہوں تو یہ آخرت میں کام نہ آئیں گے۔ انسان تجارت کرتا ہے، صنعتیں بناتا ہے تاکہ روپیہ کمائے اس کی مثال دی ہے: ﴿وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾﴾ [الفرقان: 23:25] ''اور ہم اس کی طرف متوجہ ہوں گے جو انہوں نے عمل کیا ہوگا، سو ہم اسے اڑتی ہوئی دھول کر دیں گے۔'' اس کی دوسری مثال عیسائی اقوام کی حالت ہے جو قرآن شریف نے بیان کی ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾﴾ [الکھف: 104:18] ''وہ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صنعت کے بہت اچھے کام بنا رہے ہیں۔'' اور اس کے آگے آتا ہے: ﴿فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ [الکھف: 105:18] ''سو ان کے عمل ان کے کام نہ آئے۔'' جہاں خود ﴿ضَلَّ سَعْيُهُمْ﴾ کہہ کر بتا دیا کہ ان کی کاری گریاں دنیا تک محدود ہیں دنیا میں کام آگئیں آخرت میں ان کا نتیجہ کچھ نہیں۔ کیونکہ تکمیل نفس انسانی سے ان کو کچھ تعلق نہیں۔

دوسری صورت حبط عمل کی امام راغب نے یہ بیان کی ہے کہ عمل تو آخرت کے ہوں لیکن ان کے کرنے والے کی نیت میں اللہ تعالیٰ کی رضا نہ ہو۔ جیسا حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو کہا جائے گا کہ تو قرآن اس لیے پڑھتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں سو انہوں نے کہا اب یہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال بھی صالح ہوں نیت بھی ٹھیک ہو لیکن ان کے مقابل پر برے کام بڑھے ہوئے ہوں۔ (غ) تو اس صورت میں اعمال صالح کے بوجہ ان کے ناکافی ہونے کے غرض پوری نہ ہوئی۔ جس طرح پانی کے ایک قطرہ سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ان کے علاوہ حبط عمل کی دو اور صورتیں ہیں۔

ایک وہ حبط عمل جو انبیاء کے مخالفین کے لیے خاص ہے۔ کیونکہ انبیاء دنیا میں حق پھیلانے کے لیے آتے ہیں ان کے مخالف ان کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ان کی کوششیں رائگاں جاتی ہیں کیونکہ ضرور ہے کہ حق آکر کار دنیا میں غالب آئے۔ جیسا سورۃ [آل عمران: 21] میں نبیوں اور نیک لوگوں کے قتل کرنے والوں کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ [البقرۃ: 217:2] ''سو یہی ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں کام نہ آئے۔''

دوسری صورت وہ ہے جس کا ذکر یہاں ہے۔ مسلمان تھا اچھے عمل کرتا تھا پھر کافر ہوگیا، بدی کی راہ اختیار کر لی۔ پہلی نیکیاں بھی ضائع ہوگئیں کیونکہ زندگی کا رخ ہی پلٹ گیا۔

280- هَاجَرُوا۔ هَجَرٌ اور هِجْرٌ انسان کا دوسرے سے الگ ہو جانا ہے جسم سے ہو یا زبان سے یا دل سے۔ (غ)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں۔(281)

اور مہاجرۃ: ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لینا ہے اور ظاہری معنی اس کے دارالکفر سے دارالایمان کی طرف خروج ہے۔(غ) جیسے آنحضرت ﷺ اور صحابہ کا مکہ کو چھوڑ کر مدینہ میں آ جانا۔ کیونکہ گو کافر تو دونوں جگہ موجود تھے مگر مکہ دارالکفر اس لیے ہوا کہ وہاں مسلمانوں کو دکھ دیا جاتا تھا۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ ظاہری ہجرت کا اقتضائے اصلی یہی ہے کہ شہوات اور برے اخلاق اور خطاؤں کو چھوڑا جائے یہ وہ ہجرت باطنی ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے:[الْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ] (صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ: 10) مہاجر وہ ہے جو ان باتوں سے الگ ہو گیا جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔

جٰهَدُوْا۔ جَهَدَ اور جُهْدٌ طاقت اور مشقت کو کہتے ہیں اور جہاد اور مجاہدہ کے معنی ہیں دشمن کی مدافعت میں وسعت و طاقت کا لگا دینا اور خرچ کر دینا۔(غ) امام راغب کہتے ہیں جہاد تین قسم ہے: ظاہری دشمن سے جہاد، شیطان سے جہاد، نفس سے جہاد اور ﴿جَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾[الحج: 78:22] ''اللہ کی راہ میں کوشش کرو جو اس کی (راہ میں) کوشش کا حق ہے۔'' میں ﴿وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ [التوبة: 41:9] ''اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔'' میں اور یہاں تینوں قسم کا جہاد شامل ہے اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے:[جَاهِدُوْا أَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ أَعْدَاءَكُمْ] (تفسير المنار، جلد10، صفحہ 269) اپنی خواہشات سے جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔ اور لفظ **هَجْرٌ** کی بحث میں ایک حدیث نقل کی ہے:[رَجَعْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ] (المفردات فی غریب القرآن، جلد1، صفحہ 537) تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے۔ جہاں چھوٹے جہاد سے مراد دشمن کی جنگ اور بڑے جہاد سے مراد مجاہدہ نفس ہے۔ ایسا ہی قرآن کریم میں ہے:﴿وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾[الفرقان: 52:25] اس قرآن کے ذریعہ سے ان کفار کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔ ایسا ہی منافقوں سے جہاد کا حکم ہے حالانکہ کوئی جنگ منافقوں سے نہیں ہوئی۔

مقدم کون سی ہجرت اور جہاد ہیں:

یہ آیت بتاتی ہے کہ نرا ایمان کافی نہیں۔ خدا کی رحمت کے امیدوار وہ لوگ ہیں جو ایمان کے ساتھ بدیوں کو ترک کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سارا زور لگا دیتے ہیں۔ یہ ہجرت اور جہاد ہمیشہ ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ دارالکفر سے خروج یا دشمن سے جنگ کبھی کبھی پیش آنے والی باتیں ہیں اور جب اللہ کی رحمت کی ہر وقت ضرورت ہے۔ تو یہاں مراد بھی یہی ہجرت اور جہاد ہیں۔ اسی ہجرت اور جہاد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان اپنی اصلاح اور دین اسلام کی اشاعت کی طرف سے غافل ہو رہے ہیں اور تلوار اٹھانے یا وطن چھوڑ جانے پر ہی سارا زور ہے۔ مسلمانوں کی زندگی اگر باقی رہ سکتی ہے تو اسی ہجرت اور جہاد کو اختیار کر کے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی پہلے اس کو اختیار کیا تب ہجرت ظاہری اور جہاد سیف کی اجازت ان کو ملی۔ مؤخر کو مقدم کر کے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ

کہہ ان دونوں میں بڑی برائی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور ان کی برائی ان کے فائدے سے

281- الخَمْر۔ خَمَرٌ کے اصل معنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہے اسی لیے خمار اوڑھنی کو کہتے ہیں جس کی جمع خُمُرٌ قرآن شریف میں آتی ہے۔ ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ﴾[النور: 31:24] ''اور چاہئے کہ اپنی اوڑھنیاں ڈال لیں۔'' اور خَمْرٌ شراب کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کی جائے قرار پر پردہ ڈال دیتی ہے۔(غ) یعنی انسان عقل سے کام لینے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر مفردات میں ہی ہے کہ بعض کے نزدیک خَمْرٌ ہر ایک نشہ دینے والی چیز کا نام ہے اور بعض کے نزدیک صرف انگور اور کھجور کی شراب کا نام ہے اور یہ قیاس اس سے کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ خَمْرٌ ان دو درختوں سے ہے یعنی کھجور اور انگور سے۔ مگر ظاہر ہے کہ ارشاد نبوی ﷺ: [الْخَمْرُ مِنْ هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ] (صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب بَيَانِ أَنَّ جَمِيعَ مَا يُنْبَذُ مِمَّا يُتَّخَذُ مِنَ النَّخْلِ وَالْعِنَبِ يُسَمَّى خَمْرًا: 5257) میں حصر مراد نہیں صرف دو زیادہ مروج قسموں کا نام لے دیا ہے۔ تاج العروس میں [اَلْخَمْرُ مَا أَسْكَرَ] یعنی خمر وہ ہے جس سے نشہ ہو، اصل قرار دے کر اس کے معنی پر اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ یعنی حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول کہ خمر صرف انگور سے ہے اور جمہور کا قول ہے کہ جس سے نشہ ہو وہ خمر ہے اور جمہور کے قول کو صحیح کہا ہے اور اس پر ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ شراب مدینہ میں حرام ہوئی حالانکہ وہاں انگور کی شراب قطعاً نہ ہوتی تھی صرف بسر اور تمر کی ہوتی تھی۔ یعنی تازہ اور خشک کھجور کی اور اسی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بخاری سے نقل کیا ہے۔ پس خمر کے اصل معنی ہر ایک نشہ دینے والی چیز ہیں۔

المَيْسِر۔ مَيْسِرٌ مصدر ہے جس کے معنی جوا ہیں یا اس لیے کہ یسر کے معنی سہولت ہیں اور جوئے میں مال آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے اور یا اس لیے کہ يَسْرٌ کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہیں اور مَيْسِرٌ ان کے ہاں یہ تھا کہ اونٹ ذبح کیا جاتا اور اس کے 18 یا 10 حصے کیے جاتے اور دس تیر ہوتے جن میں سے سات کے حصے ایک سے لے کر سات ہوتے اور تین خالی ہوتے پھر جس شخص کے لیے جو تیر نکلتا اس کے مطابق اس کا حصہ قرار پاتا۔ یہ بعینہ آج کل کی لاٹری ہے۔ مَيْسِرٌ کے لفظ میں لاٹری اور ہر قسم کا جوا داخل ہے۔

خَمْرٌ وَمَيْسِرٌ کا آپس میں کیا تعلق ہے اور مضمون جنگ سے جو شروع ہے کیا تعلق ہے؟ خمر عقل کو تباہ کرنے والی چیز ہے مَيْسِرٌ مال کو تباہ کرنے والی چیز ہے اور دونوں عداوت اور فساد پیدا کرنے والی چیزیں ہیں اس لیے دونوں کا اکٹھا ذکر کیا۔ اور جنگ سے یہ تعلق ہے کہ فی الحقیقت تو جنگ کے لیے عقل اور مال دونوں کی حفاظت بکار ہے۔ مگر عموماً جنگوں میں بکثرت شراب پی اور پلائی جاتی ہے تاکہ سپاہی اندھے ہو کر لڑیں۔ مگر شراب سے جو وقتی جرأت پیدا ہوتی ہے وہ حقیقی جوہر شجاعت کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ اس لیے شراب سے روکا اور عرب کے لوگ اخراجات جنگ کا روپیہ جمع کرنے کے لیے اکثر جوا کھیلتے تھے جیسے آج بھی لاٹری کا رواج ہے۔ اسی لیے جوئے کی ممانعت کے بعد فوراً یہ سوال ہے کہ پھر کیا خرچ کریں؟

مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ بڑھ کر ہے۔(281) اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ

281(۔شراب اور جوا مہذب قوموں کی اور بالخصوص عیسائی اقوام کی دو خطرناک بیماریاں ہیں اور ان کا علاج سوائے اسلام کے اور کسی مذہب نے نہیں کیا۔ بعض بدیاں ایسی موٹی ہیں کہ ان کے بدنتائج تک سب کی نظر پہنچ جاتی ہے اور بعض کے بدنتائج چونکہ ایک مدت کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لیے ہر ایک کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ شراب مؤخر الذکر بدیوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکیلے کامل مذہب نے ہی شراب کے بدنتائج کو دیکھ کر اس سے روکا۔ یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ تھی، بعض اوقات اس کی تعریف بھی کردی ہے۔ دیکھو [قاضیون: 13:9-2]، [سیمویل: 2:16]، [أمثال: 6:31]۔ حکمائے یہود نے یہاں تک کہہ دیا کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنا پر جائز مانا گیا ہے۔ یجروید میں جو چیزیں دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔ منوسمرتی میں ہے کہ ''مانس اور شراب ان دونوں کے کھانے میں کچھ دوش نہیں۔'' منوسمرتی سے ہی یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب پینے میں کچھ دوش نہیں۔ عیسائیت نے تو حد ہی کردی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر گویا رکھ دی۔ انجیل [یوحنا: 2:1-11] میں حضرت مسیح علیہ السلام کا سب سے پہلا معجزہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں جب شراب کچھ کم ہوگئی اور لوگ پورے بدمست نہ ہوئے تو حضرت مسیح علیہ السلام نے پانی کے مٹکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کمی کو پورا کیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس معجزہ میں عیسائی مذہب کی آئندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پیئے گی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی نہیں رہ سکتا جب تک سال بھر میں ایک دفعہ شراب نہ پیئے۔ کیونکہ عید فسح میں شراب جزو لازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو مسیح کے خون کا قائمقام قرار دے کر اتحاد عیسائیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ گویا عیسائیت کا اجتماع روٹی کے ٹکڑے اور شراب کے پیالہ پر ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راستباز لوگ شراب سے مجتنب رہے ہیں۔ گو وہ دوسروں کو اس سے نہ روک سکے ہوں۔ اور یہودیوں میں تو دو فرقے ایسے تھے جو شراب نہ پیتے تھے۔ مگر شراب کے خطرناک دیو کو ہلاک کرنے کے لیے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوائے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اور آپ کی یہ قوت قدسی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کا بچانا بھی مشکل ترین کام ہے اس سے آپ نے آناً فاناً ایک قوم کی قوم اور ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ آپ کے ظہور کے وقت عرب کے ملک میں اس قدر کثرت سے شراب پی جاتی تھی کہ اس کی نظیر سوائے موجودہ زمانہ کے یورپ کے اور کہیں نہیں ملتی۔ ادھر حرمت شراب کے حکم کا نازل ہونا تھا ادھر شراب مدینہ کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ لوگ خارق عادت امور میں معجزات تلاش کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا اعجاز ہوگا جس نے آن کی آن میں نسل انسانی کو اس خبیث چیز سے آزاد کر دیا۔ آج امریکہ بھی تیرہ سو سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کی نقل کرنے لگا ہے مگر کہاں نبی کی قوت قدسی جو فوراً قوم کو پاک صاف کر دیتی ہے۔ کہاں دنیاداروں کے ریزولیوشن جن سے بچنے کے لیے طرح طرح کے حیلے ابھی سے نکالے جارہے ہیں۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾

کریں؟ کہہ جو کچھ (حاجت سے) بڑھ رہے۔[282] اسی طرح اللہ تمہارے لیے کھول کر باتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو۔

حرمت شراب کی تدریج میں حکمت:

ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے جو فطرت انسانی کو پہچانتا ہے حرمت شراب کا حکم تدریجاً پہنچایا حالانکہ اور کسی بدی کی بیخ کنی میں تدریج روا نہیں رکھی۔ چنانچہ اول یہ سمجھایا کہ اس میں کچھ فوائد تو ضرور ہیں جن کی وجہ سے دنیا آج تک اس میں مبتلا رہی مگر اس کا نقصان نفع سے بہت بڑھ کر ہے اور پھر فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز میں مت آؤ ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ [النسآء: 43:4] ''نماز کے نزدیک نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو۔'' یعنی شراب نوشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں ہوسکتا اور بالآخر قطعی حکم حرمت سورۂ مائدہ میں نازل فرمایا اس کو رجس (پلیدی) قرار دیا اس کو شیطان کا کام کہا۔ فَاجْتَنِبُوا (اس سے بچو) کا حکم دیا اور آخر میں ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ [المآئدة: 91:5] ''سو کیا تم رک جاؤ گے؟'' میں تاکید کے ساتھ زجر فرمایا۔ پس اس تدریجی مگر قطعی حکم حرمت شراب میں بھی ایک حکمت تھی۔

شراب تھوڑی اور بہت، یکساں حرام ہے:

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ گو خمر کی حرمت اسی وجہ سے ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح دیگر نشہ پیدا کرنے والی اشیاء بھی اس حرمت کے اندر آجاتی ہیں مگر یہ حرمت عام ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ تھوڑی شراب جس سے نشہ نہ ہو پی لینا جائز ہے۔ خصوصیت وجہ سے عمومیت حکم پر اثر نہیں پڑتا اور حدیث میں صاف ہے: [حُرِّمَتِ الْخَمْرُ لِعَيْنِهَا قَلِيلُهَا وَكَثِيرُهَا] (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الشهادات، باب شَهَادَةِ أَهْلِ الأَشْرِبَةِ: 21475) یعنی شراب فی ذاتہٖ حرام ہے، تھوڑی ہو یا بہت۔ اور یہ بھی ہے: [مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ، فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ] (جامع الترمذي، كتاب الأشربة، باب مَا جَاءَ مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ: 1865؛ سنن ابن ماجه، كتاب الأشربة، باب مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ: 3393) جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہوجائے یعنی انسان بدمست ہوجائے وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔ اسی طرح خاص قسم کی شرابوں کا جواز نکالنا حکم قرآنی کا ابطال ہے۔ ہاں البتہ دوائی کے طور پر شراب کا استعمال ناجائز نہیں کہلاسکتا۔ اس لیے کہ دوائی کے طور پر تھوڑی مقدار میں زہر بھی دی جاسکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حرام سے دوا نہ کرو۔ مگر حالت اضطرار میں سور بھی جائز ہے۔ اس لیے حالت اضطرار اس سے مستثنیٰ ہے۔

282- اَلْعَفْوُ۔ عَفْوٌ کے اصل معنی ہیں کسی چیز کے لینے کا قصد اور اس لیے جس چیز کا قصد آسان ہو اس پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ یہاں عَفْوٌ کے معنی امام راغب نے [مَا يُسْهلُ اِنْفَاقُهُ] کیے ہیں یعنی وہ چیز جس کا خرچ کرنا سہل ہو اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین تابعین نے اس کے معنی کیے ہیں وہ مال جو تمہارے اہل کی حاجت سے زیادہ ہو۔ اور ابن کثیر میں ہے کہ بعض نے اس کے معنی

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

دنیا اور آخرت میں۔ اور تجھ سے یتیموں کی نسبت پوچھتے ہیں، کہہ ان کی اصلاح کرنا اچھا ہے اور اگر تم ان سے میل جول کرو تو تمہارے بھائی ہیں اور اللہ بگاڑنے والے کو اصلاح کرنے والے سے (الگ) پہچانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈالتا۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (283)

افضل اور طیب مال کیے ہیں اور جُوئے کی ناپاک کمائی کے مقابل پر یہ معنی نہایت موزوں ہیں اور حاجت سے بڑھا ہوا مال بھی صحیح معنی ہیں جن کی تائید میں صحیح مسلم کی ایک حدیث بھی ہے کہ جب ایک شخص نے ایک دینار کا ذکر کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اپنے نفس پر خرچ کرو'' اور دوسرے کا ذکر کیا تو فرمایا: ''اپنے اہل پر خرچ کرو۔'' اور تیسرے کا ذکر کیا تو فرمایا: ''اپنی اولاد پر خرچ کرو۔'' اسلام کی تعلیم عملی رنگ میں ہے۔ ضروریات انسانی کو وہ نظر انداز نہیں کرتا۔ ہاں بقدر حاجت اپنے نفس اور اہل اور اولاد اور اقارب پر خرچ کر کے اگر باقی کو خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے تو وہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ مسلمان اس پر عامل ہوں تو آج کروڑوں نہیں اربوں روپیہ ان کے قبضہ میں ہوسکتا ہے جو ضروریات دینی پر وہ خرچ کر سکتے ہیں۔

283- ﴿تُخَالِطُوْهُمْ﴾ خَلَطٌ سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کے اجزا کو باہم ملا دینا ہیں۔ اور دوست اور شریک اور ہمسایہ کو خلیط کہتے ہیں۔ (غ) پس مخالطت سے مراد شرکت یا باہم مل جل کر رہنا ہے۔

اِخْوَانٌ۔ اَخٌ کی جمع ہے وہ جو ولادت میں ماں یا باپ یا دونوں کی طرف سے شریک ہو مگر استعارۃً قبیلہ یا دین یا صنعت یا معاملہ یا محبت کے شریک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (غ)

اَعْنَتَكُمْ۔ مُعَانَتَةٌ اور مُعَانَدَةٌ ایک ہی ہیں۔ مگر مُعَانَتَةٌ زیادہ شدت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایسی معاندۃ ہے جس میں خوف اور ہلاکت ہو اور عَنَتٌ کسی ایسے امر میں مبتلا ہونے کا نام ہے جس میں ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو۔ (غ) اور عَنَتٌ مشقت، فساد، ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا، زنا سب پر بولا جاتا ہے۔ (ن) ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ﴾ [النسآء: 25:4] ''یہ تم میں سے اس کے لیے ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا خوف ہو۔'' ﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ [آل عمران:118:3] ''وہی چاہتے ہیں جو تمہیں تکلیف دے۔''، ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ [التوبة: 128:9] ''تمہارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے۔'' اور ﴿عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ﴾ [طٰہٰ: 111:20] ''زندہ قائم (خدا) کے سامنے بڑے بڑے لوگ ذلیل ہو جائیں گے۔'' میں عَنَتٌ بمعنی ذلت و خضعت ہے۔ (غ) یعنی ذلیل ہو گئے۔ ﴿يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ چونکہ علم کے معنی میں تمیز یا دو چیزوں کا الگ الگ کرنا بھی داخل ہے اس لیے اس کا صلہ من بھی آتا ہے اور ایسے موقعہ پر عموماً معنی تمیز کرنے کے ہوتے ہیں۔

یتیموں سے مخالطت یہ ہے کہ ان کو کھانے پینے میں، رہنے میں، تجارت میں شریک کر لیا جائے۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ دوسری

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع 27 5 11

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی ایک مشرک (بی بی) سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھی لگتی ہو اور مشرکوں کو (عورتیں) نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً ایک مومن غلام مشرک (آزاد) سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھا لگے۔ یہ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنی باتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (284)

طرف یتیم کے مال کی حفاظت کی سخت تاکید تھی۔ چونکہ یتامیٰ کے بالکل علیحدہ رکھنے میں بھی نقصان تھا اور یتیم کے ولی کے لیے بھی سخت مشکلات ہوتیں اس لیے مخالطت کی اجازت دی۔ کھانے پینے اور معمولی میل جول کی تجارت کی شراکت سے بھی بڑھ کر ضرورت ہے تاکہ ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا ہوں۔ ابومسلم کے نزدیک مخالطت سے مراد مصاہرت ہے یعنی وہ تعلقات جو نکاح کے ذریعہ قائم ہوتے ہیں۔ آج کل جو اسلامی انجمنیں کچھ یتامیٰ کی خبر گیری اپنے ذمہ لیتی ہیں تو ان کو ایسی صورت میں رکھا جاتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ان کا میل جول بہت کم ہوتا ہے اور ایسا رنگ اختیار کیا جاتا ہے جس سے ان کو اپنے یتیم ہونے کا احساس تازہ ہوتا رہتا ہے اور اس کا اثر آخر کار اخلاق پر بہت برا ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یتیموں کو بصورت طالب علمی وغیرہ دوسرے طالب علموں کے اندر ملا کر رکھا جائے۔ اس سے بدتر حالت یہ ہے کہ یتیموں کو گداگری پر مقرر کیا جاتا ہے کہ اپنا یتیم ہونا پیش کر کے ریلوے اسٹیشنوں پر اور بازاروں میں چندہ جمع کرتے پھریں۔ یہ اسلام کی تعلیم کے سراسر منافی ہے۔

284- تَنْكِحُوْا۔ نَكَحَ اس کا اصل ہے اور نِكَاحٌ کے اصل معنی عقد زوجیت ہیں یعنی مرد اور عورت کا عقد۔ اور زنا شوئی کے تعلق پر بھی بطور استعارہ بولا گیا ہے۔ (غ)

اَمَةٌ۔ مادہ اَمْوٌ ہے اور أَمَةٌ مملوکہ عورت یعنی لونڈی کو کہتے ہیں۔

عَبْدٌ۔ عُبُوْدِيَةٌ کے معنی تذلل یعنی عاجزی اختیار کرنا۔ اور عَبْدٌ چار طرح پر بولا جاتا ہے۔

اول بمعنی مملوک یعنی غلام اور اس کی جمع عَبِيْدٌ آتی ہے۔

دوم وجود میں لایا جانے کے لحاظ سے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے: ﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ

اور تجھ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ یہ ضرر (کی بات) ہے۔ پس حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے نزدیک نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ صاف ہو جائیں۔ پھر جب غسل کر لیں تو ان کے پاس جاؤ جس طرح تمہیں اللہ

عَبْدًا ﴿۹۳﴾ [مریم: 93:19] ''آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سوائے اس کے نہیں کہ وہ رحمٰن کے پاس غلام بن کر آئیں گی۔''

تیسرا عبادت اور خدمت سے عبد۔ اور یہ دو قسم ہیں۔

ایک اللہ کے عبد یعنی خالص اس کی عبادت کرنے والے جیسے: ﴿عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ﴾ [صٓ: 41:38] ''ہمارے بندے ایوب۔'' ﴿نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ [الفرقان: 1:25] ''اپنے بندے پر فرقان اتارا۔'' ﴿اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: 3:17] ''وہ شکر گزار بندہ تھا۔'' جہاں کہیں نیک بندوں کا عَبْدٌ ہونا بیان کیا ہے وہ بمعنی عَابِدٌ ہے لیکن عَبْدٌ۔ عَابِدٌ سے ابلغ ہے۔

اور دوسرے وہ جو دنیا کے بندے بن جاتے ہیں جن کی غرض دنیا اور اس کا مال ہوتا ہے۔ جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ، تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ] اور عَبْدٌ بمعنی عَابِدٌ کی جمع عِبَادٌ آتی ہے۔ یہاں عَبْدٌ بمعنی غلام ہے۔ (غ)

مَغْفِرَةٌ۔ غَفَرَ کے لیے [دیکھو نمبر: 258]۔ یہاں مَغْفِرَةٌ بمعنی حفاظت ہے کیونکہ جنت کے بعد مغفرت کو رکھا ہے۔ اللہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے جس سے مغفرت کا بلند مقام معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اللہ کی مغفرت گناہوں کی معافی سے بہت بڑھ کر مقام ہے۔ کیونکہ گناہوں کی معافی سے انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے مگر مغفرت کی ضرورت جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی ہے۔

مشرکین سے تعلقات نکاح کی ممانعت:

جنگوں کی وجہ سے یہ ضرورت پیش آ گئی تھی کہ کفار سے نکاح کے تعلقات جو باہم مودت و محبت کو چاہتے ہیں قطع کیے جائیں۔ مگر اس ضرورت پر جو حکم دیا گیا وہ اپنے اندر عمومیت کا رنگ رکھتا ہے اور سب مشرکوں کے متعلق ہے کیونکہ جنگ مشرکوں سے تھی۔ یعنی مسلمان مرد کا مشرک عورت سے اور مسلمان عورت کا مشرک مرد سے نکاح منع کر دیا۔ جو پہلے نکاح ہو چکے ہوئے تھے ان کا حکم دوسری جگہ سورہ ممتحنہ میں ہے اور گو مسلمان مردوں کا اہل کتاب کی عورتوں سے دوسری جگہ نکاح جائز قرار دیا گیا ہے مگر مشرک عورت سے کسی صورت میں نکاح جائز نہیں۔

مشرک سے بیزاری عملی رنگ میں: قرآن کریم نے شرک کو تمام بدیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ اس لیے شرک کی تمام رسومات کی

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

نے حکم دیا ہے۔ اللہ (اپنی طرف) رجوع کرنیوالوں سے محبت رکھتا ہے۔ اور وہ پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ (285)

ایک ایک کر کے بیخ کنی کی ہے۔ یہاں تک کہ ان کھانے کی چیزوں کو بھی حرام قرار دیا ہے جو دیوتاؤں وغیرہ کے نام پر مخصوص کی گئی ہوں۔ اسی طرح مشرکین کے ساتھ تعلقات معاشرت کو بھی روکا ہے یعنی نہ مشرک عورت مسلمان مرد کے گھر میں ہو، نہ مسلمان عورت مشرک مرد کے گھر میں۔ اور یوں شرک سے کامل بیزاری کی تعلیم عملی رنگ میں مسلمان کی زندگی میں داخل کر دی ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ مشرک ہیں۔ عیسائی جو حضرت مسیح کو خدا مانتے ہیں وہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔ مسیح پرست عیسائی عورتوں سے نکاح کا نتیجہ ہی ترک قوم کی تباہی ہے۔ یہ دنیوی نار ہے جس میں اس خلاف ورزیٔ حکم الٰہی نے مسلمانوں کو ڈالا ہے اور اس کے بالمقابل وہ جنت و مغفرت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ بلاتا ہے یعنی شرک سے کامل بیزاری۔ بعض فقہاء کے نزدیک مشرک میں اہل کتاب شامل نہیں بلکہ خاص عرب کے مشرک مراد ہیں اور اس لیے ان کے نزدیک عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ مشرکہ ہوں۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ مسلمان جن کو شرک اور مشرکانہ امور سے اس قدر قطع تعلق کی تعلیم دی گئی تھی آج سرتاپا خود مشرکانہ رسوم میں غرق ہیں اور قطع تعلق تو ایک طرف رہا خود ان کے تمام امور میں ملوث ہو گئے ہیں جن سے نہ صرف دور رہنا بلکہ جن کا دور کرنا ان کا کام تھا۔

285- اَلْمَحِيْضُ۔ حَيْضٌ وہ خون ہے جو خاص ایام میں خاص طور پر رحم سے جاری ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں ان کو ماہواری ایام کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ عموماً انتیس تیس دن میں ایک دفعہ یہ دن عورتوں پر آتے ہیں اور محیض حیض پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کے وقت پر بھی اور موضع پر بھی۔

اَذًى۔ اَلْمَكْرُوْهُ الْيَسِيْرُ۔ (ت) یعنی چھوٹی سی مکروہ یعنی ناپسندیدہ بات یا اَلشَّرُّ الْخَفِيْفُ یعنی تھوڑی تکلیف اور جب زیادہ ہو تو اس کو ضرر کہا جاتا ہے۔ (ت)

اعْتَزِلُوا۔ اعْتِزَال عَزَلَ سے ہے کسی چیز سے الگ ہو جانا یہاں عورتوں سے الگ ہونا بطور کنایہ ہے۔ یہ مراد نہیں کہ اس گھر میں نہ رہو یا ان کو چھوؤ نہیں۔ جس طرح ہماری زبان میں کہتے ہیں عورت کے پاس نہ جانا۔

يَطْهُرْنَ۔ طُهْرٌ نقیض نجاست بھی ہے اور نقیض حیض بھی اور عورت کو جب حیض سے نکل جائے تو طاھر کہا جاتا ہے اور پلیدی اور عیب سے پاک ہو تو طَاهِرَةٌ کہا جاتا ہے اور طَهُرَتْ کے معنی ہیں خون حیض بند ہو گیا اور تَطَهَّرَتْ اور اَطْهَرَتْ کے معنی ہیں اس نے غسل کیا۔ (ت) جس طرح انسان کی طہارت کی حالت وہ ہے جس میں وہ ترقی اور نشوونما کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ کیونکہ نجاست مانع ترقی ہے اسی طرح عورت میں حالت طہر وہ ہے جس میں استقرار حمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے گو حالت

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتی ہیں پس جب چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ اور اپنے لیے (کچھ) آگے بھیجو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور مومنوں کو خوشخبری دو۔(286)

حیض میں عورت بذاتہ نجس نہیں ہوتی لیکن اس حالت پر طہر کا لفظ اس لیے نہیں بولا گیا کہ وہ اس حالت میں نسل انسانی کی ترقی کی اس غرض کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوتی، جس کے لیے قدرت نے اسے بنایا ہے۔ زبان بھی پُرحکمت ہے۔

مسائل طلاق کا تعلق جنگ سے:

یہاں سے اکتیسویں رکوع کے آخر تک حیض، طلاق اور بیوہ عورتوں کے متعلق مسائل کا ذکر ہے۔ یہ چند ایک فروعی مسائل ہیں۔ جن کا باہم بھی تعلق ہے اور جنگ سے بھی۔ جنگ سے عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور ان کے نکاح اور عدت کے احکام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ احکام مطلقہ عورتوں کی عدت وغیرہ کے احکام سے ملتے جلتے ہیں اس لیے طلاق کے مسائل کا ذکر آیا اور مسئلہ طلاق کا تعلق ایام ماہواری سے ہے کیونکہ ان ایام میں طلاق ناجائز ہے۔ اس لیے یہاں سے ابتدا کی پھر طلاق کے مسائل بتائے پھر بیوہ عورتوں کے۔ علاوہ ازیں جنگ کی حالت میں قومیں اپنے عامہ قوانین کو درست نہیں کرسکتیں۔ اس کے برخلاف اسلام کی قریباً ساری شریعت حالت جنگ میں ہی نازل ہوئی گویا اگر ایک طرف جنگ درپیش ہے اور اس کا ایک لمبا سلسلہ کئی سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ تو دوسری طرف کل اصلاح قومی کے کام بھی انہی ایام میں تکمیل پاتے ہیں اور کون قوم اس کی نظیر پیش کرسکتی ہے۔

یہاں سوال ایام حیض میں مقاربت کا ہے جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے اس لیے هُوَ اَذًى میں اشارہ مقاربت کی طرف ہے یعنی ایام حیض میں عورت سے مقاربت ضرر رساں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ حیض خود ضرر رساں ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک عورت حالت حیض سے نکل کر غسل نہ کرلے یا بوجہ کسی مجبوری کے تیمم کے ذریعہ سے طاہر نہ ہوجائے اس کے قریب جانا منع ہے۔ اور قرآن کریم نے بھی لفظ تَطَهَّرْنَ اختیار کرکے غسل کی طرف اشارہ کیا ہے مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت گزر جائے جو دس دن ہے تو پھر محض خون کا بند ہونا کافی ہے۔ آیت کے آخری الفاظ میں کہ اللہ تعالیٰ پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت کی طرف توجہ دلائی۔

286- اَنّٰى۔ مفردات میں ہے کہ اَنّٰى میں حالت اور مکان دونوں کا تعلق ہوتا ہے اس لیے وہ اَیْنَ یعنی جہاں اور کَیْفَ یعنی جس طرح دونوں معنی میں آتا ہے۔ ضحاک سے یہاں اَنّٰى کے معنی مَتٰی یعنی جب مروی ہیں اور روح المعانی میں ہے کہ یہ تینوں معنی جم غفیر سے ثابت ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: [اَنّٰى شِئْتُمْ، مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ] جب چاہو رات کو یا دن کو یہی معنی ترجمہ

وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ

اور اللہ کو اپنی قسموں کی آڑ نہ بناؤ کہ نیک سلوک اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان اصلاح نہ کرو اور اللہ سننے والا

میں اختیار کیے گئے ہیں۔

قرآن کریم ایک کامل کتاب ہے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ تمام حالات انسانی کے متعلق ضروری ہدایات دیتا۔ انہی میں مرد اور عورت کے تعلقات بھی ہیں۔ مگر قرآن شریف کا یہ کمال ہے کہ ان تعلقات کے اظہار میں بھی ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جو نازک سے نازک کان پر گراں نہیں گزرتے اور بایں سب باتیں بھی بتادی ہیں۔

بائبل میں فحش قصے: بائبل جسے عیسائی دنیا مقدس کتاب کہہ کر اسے تمام عالم سے منوانا چاہتی ہے اس کے اندر ایسے مضامین محض قصوں کے رنگ میں ہیں کہ جن کو تنہائی میں بھی ایک شخص پڑھ کر شرم سے پسینہ پسینہ ہوجائے۔ اس تہذیب کے زمانہ میں سوامی دیانند جی نے جو کچھ نیوگ کے بارہ میں ستیارتھ پرکاش کے چوتھے باب میں لکھا ہے اور پھر اسی باب کی دفعہ 43 میں جن خیالات کا اظہار گربھاوان سنسکار کے نیچے کیا ہے وہ مرد اور عورت کے تعلقات میں ایسے ننگے الفاظ ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی کسی مہذب مجلس میں ہرگز استعمال نہیں کرسکتا۔ مگر زمین عرب کا ایک امی آج سے تیرہ سو سال پیشتر کس طرح ان نازک تعلقات کو پاک اور شُستہ الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ یہ بجائے خود اس کا معجزہ ہے حالانکہ اسی زمانہ کے عربی اشعار میں ان ہی تعلقات کا ذکر نہایت فحش الفاظ میں پایا جاتا ہے اور عام مذاق یہاں تک بگڑا ہوا ہے کہ ان اشعار کو فخریہ مجلسوں میں دہرایا جاتا ہے۔

عورت کے بمنزلہ کھیتی ہونے سے مراد:

ایسا ہی یہ بھی ایک مضمون ہے جسے نجاست پسند لوگ خواہ مخواہ محل اعتراض بناتے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ عورت تمہارے لیے بمنزلہ ایک کھیتی کے ہے۔ گویا مرد و عورت کے تعلقات کا حقیقی مقصود نسل انسانی کا بڑھانا ہے تو چونکہ ایام حیض میں علاوہ بیماری اور ضرر کے اندیشہ کے یہ مقصود بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ایام حیض میں جو عورتوں کے قریب جانے سے منع کیا تھا کہ وہ ایک دکھ اور ضرر کی بات ہے۔ ﴿اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ سے مراد اسی کی ایک دوسری وجہ یہاں بیان فرمائی ہے کہ جب اصل غرض نسل انسانی کی نشوونما ہے جس طرح کھیتی میں اصل غرض بیج کی نشوونما ہے تو ایام حیض میں عورت کے قریب جانا درست نہیں۔ بے شک ان کے پاس جاؤ مگر اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس کی کوئی غرض ہے۔ اس غرض کو مدنظر رکھو تو جب چاہو یا جس طرح چاہو یا جہاں چاہو، ان کے پاس جاؤ۔ اور اس سے پہلی آیت میں صاف فرمادیا کہ ان کے پاس جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے جاؤ۔ اللہ کا حکم فطرت انسانی کے مطابق ہے اور مذہب اسلام کو اسی لیے فطرت کا مذہب بتایا: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ [الروم: 30:30] ''اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر قائم رہ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔'' پس خلافِ فطرت کی تو خود یہاں تردید موجود ہے۔ ایسی پاک کتاب پر محض اس لیے کہ الفاظ میں کنایہ اختیار کیا گیا ہے وہ اعتراض کرنا جو اس کے صریح مقصود اور منشاء کے خلاف ہے ایک ذلیل حرکت ہے۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ جاننے والا ہے۔(287)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

اللہ تمہاری بلاارادہ قسموں پر تمہیں نہیں پکڑتا لیکن وہ اس پر تمہیں پکڑتا ہے جو تمہارے دلوں نے کمایا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔(288)

287- عُرْضَةٌ۔ عَرَضٌ سے ہے [دیکھو نمبر: 106]۔ اور عُرْضَةٌ وہ چیز ہے جو کسی چیز کے سامنے حائل کر دی جائے۔ (غ) ڈھال کو بھی عُرْضَةٌ کہتے ہیں۔

اِیْمَانٌ۔ یَمِیْنٌ کی جمع ہے۔ اصل معنی دایاں ہاتھ۔ استعارۃً قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے باعتبار فعل کے جو حلف اٹھانے والا یا معاہدہ کرنے والا کرتا ہے۔ (غ)

تَبَرُّوْا۔ بِرٌّ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 67]۔ اور بِرُّ الْوَالِدَیْنِ کے معنی ہیں ان کے ساتھ احسان میں تَوَسُّع یعنی فراخی۔ (غ) یہی معنی تَبَرُّوْا کے یہاں ہیں اور یہی [الممتحنة: 8:60] میں جہاں غیر مسلموں سے سلوک کا ذکر ہے۔

طلاق کے مسائل کے لیے ہی ایک امر کا ذکر ہو چکا۔ اب اسی ذکر میں ایک دوسرے تمہیدی امر کا ذکر فرماتا ہے۔ طلاق کی ایک قسم عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی جس کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں آتا ہے جس میں مرد قسم کھا لیتا تھا کہ وہ عورت کے پاس نہیں جائے گا۔ چونکہ سب سے پہلے اس قسم کی طلاق کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے اس لیے تمہیداً قسم پر کچھ فرمایا اور اس قسم کو ان قسموں میں سے ایک قرار دے کر جن میں انسان ایک نیکی یا نگہداشت حقوق یا اصلاح کے کام سے رک جاتا ہے اس سے روکا ہے اور ساتھ ہی ایک عام اور وسیع تعلیم دے دی ہے کہ کبھی اپنے آپ کو ایسے امر کا پابند نہ کرو جس میں اچھے کام کرنے سے رک جاؤ۔ یا جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں ان کی رعایت نہ کر سکو یا اصلاح کی بات کو ترک کرنا پڑے خواہ اللہ کی قسم ہی کیوں نہ کھالی ہو۔ یعنی اپنی طرف سے ایسا عہد اللہ کے ساتھ ہی کیوں نہ کر لیا ہو۔ جب ایسا عہد اللہ کے ساتھ جائز نہیں کیونکہ وہ تو نیکی سکھاتا ہے اور رعایت حقوق کی تاکید کرتا ہے تو دوسروں کے ساتھ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ جن ملازمتوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق چھیننے یا ان کو دکھ دینے کی نوبت پہنچے وہ بھی اس کے ماتحت آجاتی ہیں۔

288- اَللَّغْو۔ لَغْوٌ کلام وہ ہے جو شمار کے قابل نہ ہو یعنی غور و فکر سے نہ کی جائے۔

حَلِیْمٌ۔ حِلْمٌ کے معنی نفس اور طبیعت کو غضب کے جوش میں آنے سے روکنا ہے۔ (غ) اور حلیم جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں آیا ہے اس کے معنی لسان العرب میں اَلصَّبُوْرُ دیئے ہیں جس کی تشریح یوں کی ہے کہ اسے نافرمانوں کی نافرمانی ہلکا نہیں بناتی نہ ان پر غضب اسے اپنے آپے سے باہر کر دیتا ہے۔ لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان معمولی بات چیت میں عادت کے طور پر کھا لیتا ہے۔ عرب کے لوگ بات بات پر کہہ دیا کرتے تھے لَا وَاللّٰہِ۔ بَلٰی وَاللّٰہِ ہمارے بعض فاضل بھی اپنی فضیلت کے اظہار

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں کے حق نہ دینے کی قسم کھالیتے ہیں چار ماہ کا انتظار ہے پھر اگر وہ رجوع کریں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(289)

کے لیے وَاللّٰهِ بِاللّٰهِ ثُمَّ تَاللّٰهِ کے سوائے گفتگو نہیں کر سکتے۔ ﴿بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان قصد اور ارادہ سے کھاتا ہے۔ اسی طرح کی قسم کے لیے دوسری جگہ کفارہ کا دینا مذکور ہے[المآئدۃ: 89:5]۔

لغو قسم کھانے کی ممانعت: مگر لغو قسم پر جو بے سوچے سمجھی کھائی جائے یہ سختی نہیں رکھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لغو قسمیں کھانے سے نہیں روکا بلکہ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾[المؤمنون: 3:23] ''اور جو لغو سے منہ پھیرنے والے ہیں۔'' میں ہر لغو بات اور فعل سے روکا ہے اور خود قسم کی حفاظت کا ذکر دوسری جگہ ہے ﴿وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ﴾[المآئدۃ: 89:5] ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔''

289- يُؤْلُوْنَ۔ إِيْلَآءٌ حرف ہے جو ہر شش جہات میں کسی نہایت کو ظاہر کرتا ہے اور اَلْوَتُ فِي الْاَمْرِ کے معنی ہیں میں نے اس امر میں کوتاہی کی۔ گویا اس میں کام کرنے والا انتہا کو دیکھ لیتا ہے اور آگے نہیں چلتا ﴿لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾[آل عمران: 118:3] ''وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے۔'' اور إِيْلَآءٌ وہ قسم ہے کہ جس کی غرض کسی کام میں یعنی کسی حق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ہو۔ اصطلاح شریعت میں إِيْلَآءٌ یہ ہے کہ مرد قسم کھالے کہ میں اپنی بی بی کے پاس نہ جاؤں گا یعنی ایسی قسم جس میں عورت کے حقوق کی ادائیگی میں کمی واقع ہو۔(غ)

﴿فَآءُوْ﴾ فَيْءٌ سے ہے جس کے معنی ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا۔(غ)

عورت کے پاس جانے کی قسم:

سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کو نہ چاہتا اور یہ بھی پسند نہ کرتا تھا کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کر لے تو قسم کھالیتا تھا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤں گا اور اس طرح پر اسے معلقہ چھوڑ دیتا نہ وہ خاوند والی ہوتی نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی اور اس کی غرض صرف عورت کو دکھ پہنچانا تھا۔ اس لیے طلاق کے مسائل میں سب سے پہلے اس بدرسم کا علاج فرمایا۔ قرآن کریم نے اول تو إِيْلَآءٌ کو ان قسموں میں داخل کر کے جو نیکی اور نگہداشت حقوق سے رکنے کی قسمیں ہیں منع فرمایا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو پھر صرف چار ماہ کی مہلت دی ہے یا اس عرصہ میں رجوع کرے اور رجوع کو اچھی حالت ٹھہرایا ہے جیسا کہ لفظ فَآءُوْ کے استعمال سے ظاہر ہے۔ چار ماہ گزرنے کے بعد بعض کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے لیکن دوسری جگہ نکاح کرنے کے لیے اسے پھر عدت پوری کرنی چاہیے اور بعض کے نزدیک چار ماہ گزرنے پر عورت بذریعہ حاکم خاوند کو مجبور کر سکتی ہے کہ یا وہ رجوع کرے اور یا طلاق دے دے۔ الفاظ قرآنی پہلے خیال کے مؤید ہیں۔

وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کریں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(290)

290- عَزَمُوْا۔ عَزْمٌ کسی کام کے کرگزرنے پر دل کو مضبوط کر لینا ہے۔

اَلطَّلَاقُ۔ طَلَاقٌ کے اصل معنی بندش سے آزاد کرنا ہیں اور معاہدہ نکاح سے آزاد کرنے پر بالخصوص بولا گیا ہے۔

یہاں سے طلاق کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ عربوں میں طلاق کے متعلق حد درجہ کی آزادی تھی۔ عورت کی کوئی منزلت نہ تھی۔ نہ معاہدہ نکاح کو کچھ وقعت دی جاتی تھی۔ جب چاہا طلاق دے دی جب چاہا واپس لے لیا۔ یہودیوں کی شریعت میں بھی نسبتاً طلاق میں زیادہ آزادی تھی بالمقابل بعض اقوام مثلاً ہندوؤں میں نکاح کا فسخ ہونا کسی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دیا۔ عیسائی مذہب کی جو بنیادی اینٹ طلاق کے مسئلہ میں ہے وہ ایسا تنگ قانون ہے کہ آج عملاً تمام عیسائی اقوام خود اسے ترک کر چکی ہیں۔ انجیل میں ہے:

''یہ بھی کہا گیا کہ جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑ دے اسے طلاق نامہ لکھ دے پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو زنا کے سوائے کسی اور سبب سے چھوڑ دیوے اس سے زنا کرواتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے زنا کرتا ہے۔'' [متی: 5:31-32]

اس بنیاد پر جو عمارت عیسائی اقوام نے قانون طلاق کی بنائی تھی آج اسے زمانہ نے پاش پاش کر دیا۔ کون سا عیسائی ملک ہے جس میں آج ان الفاظ کو ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکا گیا؟ آئے دن ان کے خلاف قانون بنتے ہیں اور مسیح کو خدا خدا کر کے پکارنے والے پارلیمنٹوں میں اکٹھے ہوتے اور ان الفاظ کو ناممکن العمل قرار دیتے ہیں۔ کیوں نہ ہو خدا نے خود آ کر تھوڑی یہ شریعت بنائی تھی؟ پھر اس مذہب کو دنیا میں پیش کرنا کیا شرم کی بات نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے جب طلاق کے معاملہ میں افراط کی تو حضرت مسیح نے جن کی تعلیم خود مختص القوم اور مختص الزمان تھی وقتی علاج کے طور پر یہ ہدایت دی تھی اور ہمیشہ تک رہنے والی شریعت جو تمام معاملات میں اعتدال کی راہ پر چلاتی بعد میں آنے والی تھی۔

اسلام نے طلاق میں اعتدال قائم کیا:

چنانچہ اسلام نے طلاق کے مسئلہ کو صحیح بنیاد پر قائم کیا، نہ تو یہودیوں اور عربوں والی آزادی باقی رکھی نہ ہندوؤں اور عیسائیوں کی تنگی کو ممکن العمل قرار دیا اور ایک ایسے میانہ راہ کی ہدایت کی جس کی طرف آج خود ساری دنیا کا رجحان ہو رہا ہے۔ یعنی ایک طرف اگر طلاق کی اجازت دی تو دوسری طرف بہت سی قیود اور شرائط کے ماتحت اسے کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے قرآن کریم کے اصل منشا کو سمجھ کر فرمایا: [أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللهِ الطَّلَاقُ] (سنن أبي داؤد، كتاب الطلاق، باب فِي كَرَاهِيَةِ الطَّلَاقِ: 2180) ''تمام حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز خدا کو طلاق ہے۔'' یہ لفظ ہر ایک مسلمان کے لیے سوائے اشد ضرورت کے کافی روک ہیں۔ طلاق کے مسئلہ میں جس قدر حد بندیاں قرآن شریف نے قائم کی ہیں ان کا ذکر آگے آتا ہے۔

وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں[291] اور ان کے لیے جائز نہیں کہ اسے چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے۔ اگر

ہاں یہ سچ ہے کہ اسلام نے ان وجوہ کو معین ومخصوص نہیں کیا جن پر طلاق دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اسلام کا وسیع قانون سب زمانوں اور سب قوموں کے لیے تھا۔ ایسی وجوہات کا معین کرنا درست نہ ہوتا۔ آج عیسائی اقوام کی جو سب ایک ہی مذہب کے پیرو ایک ہی درجہ تعلیم وترقی پر یکساں قوانین معاشرت وتمدن کے پیرو ہیں یہ حالت ہے کہ ان میں سے کوئی دو قومیں اس بات پر متفق نہیں کہ وجوہات طلاق کن کن امور کو رکھا جائے۔ پس اسلام نے ایک ایسی راہ بتائی ہے جو تمام نقصوں سے خالی ہے۔ آج سے تیرہ سو سال پیشتر عرب کا ایک امی اپنے ذہن سے یہ قانون نہ بنا سکتا تھا۔ جب آج بڑے بڑے مہذب اور تعلیم یافتہ بھی اس سے عاجز ہیں۔

291- قُرُوْءٌ۔ قَرْءٌ کی جمع ہے اور قَرْءٌ حقیقت میں حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہونے کا نام ہے اور چونکہ دونوں باتوں کا جامع ہے یعنی طہر اور حیض کا اس لیے بعض وقت دونوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے۔ (غ) مفردات میں ہے کہ ہر ایک اسم جو دو صفتوں کو اکٹھا چاہتا ہو وہ الگ الگ بھی ہر ایک پر بولا جاسکتا ہے۔ پس ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ یہ ہے کہ عورت تین دفعہ حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہو۔

طلاق حالت طہر میں ہوسکتی ہے:

ان الفاظ میں گو بظاہر عدت کا ہی ذکر ہے مگر لفظ قُرُوْءٌ کو لاکر یہ بتادیا ہے کہ طلاق دینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ حالت طہر میں دی جائے۔ کیونکہ عدت شروع نہیں ہوسکتی جب تک حالت طہر موجود نہ ہو۔ جس سے حالت حیض کی طرف انتقال ہو۔ (برخلاف بیوہ کے کہ وہاں عدت دنوں اور مہینوں کی گنتی سے ہوتی ہے) ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ [الطلاق: 1:65] ''تو انہیں ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔'' میں اسی طرف اشارہ ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حالت حیض میں طلاق دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا۔ یہ شرط درحقیقت طلاق پر ایک روک ہے کیونکہ حالت حیض میں تو مرد اور عورت الگ الگ ہوتے ہیں اس وقت طلاق کا دینا سہل ہے مگر حالت طہر میں میاں بی بی میں تعلقات محبت قائم ہوتے ہیں اس وقت طلاق دینا زیادہ مشکل ہے۔

دوسری حد بندی جو انہی الفاظ میں طلاق پر رکھی ہے وہ عدت یا زمانہ انتظار ہے۔ اس کی ایک بڑی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ تھوڑی علیحدگی میں ایک دوسرے کی قدر معلوم ہوجائے اور خیالات محبت اگر اس تعلق میں فی الواقع موجود ہیں تو ان خیالات منافرت پر جو عارضی طور پر پیدا ہوگئے ہیں غالب آجائیں۔ گویا طلاق دینے کے ساتھ فوراً واقع نہیں ہوتی بلکہ قریباً تین ماہ کا وقفہ دیا جاتا ہے جس میں اگر ممکن ہو تو اصلاح ہوجائے۔ نکاح تو بغیر میاں بی بی میں مودت ومحبت کی اصل غرض کو پورا ہی

بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع 28 7 12

وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں[292] اور اس (اثناء) میں ان کے خاوند ان کو واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ اصلاح چاہیں[293] اور ان کے لیے پسندیدہ طور پر (حقوق) ہیں جیسے ان پر (حقوق) ہیں اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔[294]

نہیں کرسکتا اور اگر محبت نہ ہو تو نہ صرف میاں بی بی کے اخلاق ہی تباہ ہوتے ہیں بلکہ اولاد کے اخلاق بھی بگڑ جاتے ہیں۔ ہاں بعض وقت اصل محبت تو موجود ہوتی ہے مگر عارضی طور پر کوئی اسباب منافرت کے پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان کے دو رہونے اور خیال محبت کے پھر غالب آجانے کے لیے یہ وقفہ رکھ دیا۔ عدت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس مدت میں حمل ظاہر ہوجائے۔ جیسا کہ اس سے اگلے الفاظ میں ذکر بھی کر دیا ہے۔

292- اَرْحَامَ۔ رَحِمٌ کی جمع ہے اور یہ معروف ہے۔

عدت کی ایک غرض تو ظاہر تھی جس کی طرف اوپر نوٹ میں توجہ دلائی گئی ہے اور وہ طلاق کی آزادی پر ایک حد بندی ہے۔ یہاں عدت کی ایک دوسری غرض کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ اگر عورت کو حمل ہو تو اس میعاد میں وہ بھی ظاہر ہوجائے گا۔ چونکہ اولاد میاں بی بی کے تعلقات محبت میں ایک بڑا واسطہ بن جاتی ہے اس لیے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اکثر حالات میں بی بی کا صاحب اولاد ہونا طلاق کے لیے مانع ہوجاتا ہے۔

293- بَعُوْلَةٌ۔ بَعْلٌ کی جمع ہے۔ بعل اصل میں وہ ہے جو دوسرے پر فوقیت رکھتا ہو اور خاوند بھی بعل کہتے ہیں۔

یہ طلاق پر تیسری حد بندی ہے یعنی اس وقت عدت کے اندر اگر اصلاح چاہیں (اور اصلاح کا تو حکم ہے) تو خاوند اس بات کا حق دار ہے کہ بی بی کو اس کی طرف لوٹا یا جائے اس میں ہر ایک قسم کی جلد بازی کا جو طلاق کے معاملہ میں اختیار کی جاسکتی ہے علاج متصور ہے۔ تین ماہ کے عرصہ میں انسان کو خوب غور و فکر کا موقعہ مل سکتا ہے اور عارضی رنجشیں دور ہو کر انسان ٹھنڈے دل سے غور کرسکتا ہے۔ اور اگر میاں بی بی میں کچھ بھی حقیقی محبت ہے تو وہ چنگاری تمام عارضی رنجشوں کو جلا کر اصلی تعلق کو قائم کردے گی اور یہاں اصلاح کا ذکر کرکے اور اَحَقُّ کا لفظ لاکر بتا دیا کہ جہاں تک ممکن ہو پہلے تعلق کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

294- مَعْرُوْفٌ۔ عُرْفٌ سے ہے [دیکھو نمبر: 256]۔ اور معروف اس امر کو کہتے ہیں جس کا اچھا یا پسندیدہ ہونا شریعت کی رو سے پہچانا جاسکے۔ (غ)

دَرَجَةٌ۔ مَنْزِلَةٌ یا بلندی کا مرتبہ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ

(یہ) طلاق دو دفعہ ہے پھر پسندیدہ طور پر رکھنا یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے(295) اور تمہارے لیے

عورتوں اور مردوں میں مساوات حقوق اور مردوں کی فوقیت:

ان الفاظ میں قرآن کریم نے دو مشکلات کو کمال خوبی سے حل کیا ہے یعنی اول تو اس اصول کو قائم کیا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ گویا بلحاظ حقوق مرد وعورت میں مساوات ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمام مذاہب بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ آج تک مہذب اقوام نے بھی پورا پورا اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ لیکن دوسری طرف مساوات حقوق میں ایک نقص پیدا ہوتا تھا کہ پھر خانگی امور میں نظم کیونکر قائم رہے۔ کیونکہ کوئی نظم قائم نہیں ہوسکتا جب تک اس میں ایک کو دوسرے پر کچھ فوقیت نہ دی جائے اور معاشرت یا خانہ داری جس پر نسل انسانی کی ساری بہبودی کا دارومدار ہے تمدن انسان کی پہلی کڑی ہے۔ کیونکہ تمدن باہم مل جل کر رہنے کا نام ہے اور اس کی ابتدا معاشرت یا خانہ داری سے ہوتی ہے۔ جس طرح تمدن میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے اسی طرح معاشرت میں یا گھر کے انتظام میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے تاکہ نظم قائم رہے۔ پس مساوات حقوق کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک فوقیت بھی ہے۔ اگر نری مساوات ہوتی تو خانہ داری تباہ ہوجاتی۔ اگر سلسلہ نظام عالم پر غور کیا جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ مرد کو عورت پر ایک فوقیت حاصل ہے۔ مرد میں قوت وشجاعت کے جوہر عورت سے بڑھ کر ہیں۔ گو عورت میں رحم ومحبت کے جوہر مرد سے زیادہ ہیں۔ مگر نظام عالم میں قوت وشجاعت کو حکومت کرنے کے لیے فوقیت دیتی ہے۔ پس نہ تو مردوں کو عورتوں کے حقوق کی مساوات کا انکار کرنا چاہیے نہ عورتوں کو مردوں کی اس فوقیت کا جو قدرت نے ان کو دی ہے۔ یہ ایک توازن ہے جس کے بغیر نظم خانگی برباد ہوجائے گا۔ جس طرح تمدن میں ایک طرف مساوات حقوق قائم کی اور رعایا کے حقوق حکام پر قائم کیے ہیں اسی طرح معاشرت میں مرد وعورت کے حقوق کی مساوات قائم کرکے عورت کے حقوق مرد پر قائم کیے ہیں۔

طلاق کے مضمون میں عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلانا اس غرض سے ہے کہ مرد یہ نہ سمجھ لیں کہ چونکہ طلاق کا دینا ان کے اختیار میں دیا گیا ہے اس لیے عورتوں کے کوئی حقوق ہی نہیں۔ ان کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں اور یوں یہ چوتھی حد بندی طلاق پر ہے۔

295- اِمْسَاكٌ۔ کسی چیز سے تعلق رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے۔ (غ)

تَسْرِيْحٌ۔ سَرَحَ اونٹ کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑنا ہے اور عقد نکاح سے آزاد کرنا تسریح ہے۔ (غ) ﴿وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ [النحل: 6:16] ''اور جب چرانے لے جاتے ہو۔''

طلاق دو دفعہ ہے:

مفسرین کہتے ہیں وہ طلاق مراد ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہے جس کی عدت میں خاوند رجوع کرسکتا ہے۔ جس کو اصطلاح

تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ جائزنہیں کہ تم اس (مال) سے کچھ لو جو تم نے اُنہیں

میں طلاق رجعی کہا جاتا ہے۔مگر حق یہ ہے کہ قرآن شریف نے دوسری کسی طلاق کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور نہ قرآن شریف میں اور نہ حدیث صحیح میں کہیں یہ حکم ہے کہ طلاق دینے کے لیے تین دفعہ طلاق کا کہنا ضروری ہے۔تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت ان تکالیف کو دور کرنے کے لیے نازل ہوئی جو عورتوں کو بار بار طلاق دے کر اور پھر عدت کے اندر رجوع کر کے پہنچائی جاتی تھیں۔ترمذی میں اس مضمون کی حدیث بھی ہے کہ ایک شخص طلاق دیتا اور پھر رجوع کر لیتا گو ہزار مرتبہ ایسا کرے اس کا علاج قرآن شریف نے ان الفاظ میں کیا کہ طلاق اور پھر عدت کے اندر رجوع بار بار نہیں ہوسکتا۔ بلکہ صرف دو دفعہ ہوسکتا ہے۔اس کے بعد اگر تیسری دفعہ طلاق دے تو پھر عدت کے اندر رجوع کا اختیار نہیں اور یہ طلاق پر پانچویں حد بندی ہے۔

پس ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ میں صرف عرب کی اس بیماری کا علاج ہے جو بار بار طلاق دے کر رجوع کرتے تھے۔لیکن اس سے لوگوں نے طلاق رجعی اور طلاق بائن کی تفریق نکالی ہے اور وہ اس طرح کہ قرآن شریف جو دو مرتبہ طلاق کے بعد رجوع کی اجازت دیتا ہے تو اس کو باطل کرنے کے لیے لوگ عورت پر تین طلاق اکٹھی کہہ دیتے ہیں۔یعنی بجائے ایک دفعہ کہنے کے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں تین دفعہ طلاق ایک ہی وقت میں کہہ دیتے ہیں اور اس کو طلاق بائن قرار دے لیا ہے۔یعنی اس کے بعد خاوند نہ عدت کے اندر رجوع کرسکتا ہے جیسا کہ [آیت نمبر: 228] کا منشا تھا۔ اور نہ بعد عدت کے دوبارہ اسے اپنے نکاح میں لاسکتا ہے جیسا کہ [آیت نمبر: 232] کا منشا ہے۔فقہا کے ایک گروہ نے اس قسم کی طلاق کو طلاق بائن تو قرار دیا لیکن فی الواقع یہ بتانے کو کہ یہ طریق اسلامی کے خلاف ہے اس کا نام طلاق بدعی رکھا ہے۔اور افسوس یہ ہے کہ اس بدعت کو دور کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اس کو تسلیم کر لیا۔حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ رکانہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بی بی کو طلاق بتہ دی ہے۔تو آپ نے فرمایا تیرا ارادہ کیا تھا؟ تو کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔جس پر آپ نے رجوع کی اجازت دی اور نسائی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی شخص کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بی بی کو تین مرتبہ اکٹھی طلاق دی ہے:[فَقَامَ غَضْبَانَ ثُمَّ قَالَ: أَ يُلْعَبُ بِكِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ] (سنن النسائی، کتاب الطلاق، باب الثَّلَاثُ الْمَجْمُوعَةُ وَمَا فِيهِ مِنْ التَّغْلِيظِ: 3401) (مشکوٰۃ) آپ سخت ناراض ہو کر اٹھے اور کہا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ہنسی کی جاتی ہے اور میں تمہارے درمیان ہوں۔ پس آنحضرت ﷺ اس کو کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں اور آج یہ حالت ہے کہ مسلمانوں میں جب کوئی طلاق دے تو اس کا پہلا لفظ یہی تین طلاق ہوتا ہے اور یہ سارا الزام علما کے ذمہ ہے کہ وہ عوام کو اس سے آگاہ نہیں کرتے کہ یہ طریق طلاق وہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیا ہے۔اگر مسلمانوں کو یہ علم ہو تو وہ کبھی جرأت نہ کریں کہ جب طلاق ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہوسکتی ہے تو خواہ مخواہ وہ طریق اختیار کریں جسے محمد رسول اللہ ﷺ کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں۔ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے کا رواج جاہلیت میں تھا اور نبی کریم ﷺ

نے تعلیم قرآنی کے ماتحت اسے روکا تھا مگر یہ بیماری آہستہ آہستہ پھر زور پکڑ گئی۔ یہاں تک کہ آج شاذ و نادر ہی کوئی مسلمان اس کے اثر سے خالی رہا ہے۔

اس بارہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ سے بھی ایک غلط نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے دو سال میں تین طلاق کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا تھا لیکن (لوگوں نے جب یہی طریق اختیار کر لیا تو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: [إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ قَدْ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ. فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ] (صحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب طَلاَقِ الثَّلاَثِ: 3746) یعنی لوگ اس معاملہ میں جلدی کرتے ہیں جس میں انہیں ڈھیل دی گئی تھی تو بہتر ہو کہ ہم ان پر اسی طرح حکم لگا دیں۔ سو ایسا ہی لگا دیا۔ اول تو ایک صحابی کا فعل حجت شرعی نہیں۔ دوسرے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم بطور سزا جاری کیا تھا تا کہ لوگ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے سے رک جائیں۔ جب ان کی اصل غرض بھی اس بدعت سے لوگوں کو روکنا تھا۔ تو ان کے فعل سے اس کا جواز کیونکر نکالا جا سکتا ہے۔ اور ترمذی میں ہے: [فَرُوِيَ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّهُ جَعَلَ الْبَتَّةَ وَاحِدَةً] (جامع الترمذي، كتاب الطلاق واللعان، باب مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يُطَلِّقُ امْرَأَتَهُ الْبَتَّةَ: 1177) یعنی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے طلاق بتہ یعنی تین طلاق کو ایک ہی قرار دیا۔ پس ممکن ہے کہ آپ نے وہ حکم صرف عارضی طور پر جاری کیا ہو۔ بہر حال ان کا یہ فعل کسی صورت میں تین اکٹھی طلاق کو تین علیحدہ علیحدہ طلاقوں کا قائمقام نہیں بنا سکتا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف مروی ہے۔

فقہا نے طلاق کو تین قسم قرار دیا ہے:

طلاق بدعی یہی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے اور جو کسی صورت میں جائز نہیں، مسلمانوں کو اس سے رکنا چاہیے۔ دوسری قسم کی طلاق وہ ہے جسے وہ **حسن** کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مرد تین طہروں میں الگ الگ تین طلاقیں دے اس کو بھی بائن قرار دیا ہے۔ اس کی کوئی سند بھی صراحت سے نہیں ملتی۔ قرآن شریف میں تو قطعاً یہ ذکر نہیں کہ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں بلکہ صاف الفاظ ہیں: ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ [الطلاق: 1:65] ''تو انہیں ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو'' یعنی جب ایک طلاق دی تو اب اس کے لیے ایک عدت ہے جو تین قَرْءٌ ہے اور جب ایک طلاق کے بعد تین قَرْءٌ انتظار کا حکم صراحت سے قرآن شریف میں موجود ہے تو پھر دوسری تیسری طلاق کیا ہوئی؟ اور اس کے بعد وہ انتظار بموجب حکم قرآن کیوں نہ ہو؟ کسی حدیث میں بھی جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے کوئی ایسا حکم موجود نہیں کہ طلاق اس طرح دی جائے کہ ہر طہر میں ایک طلاق ہو۔ اس لیے یہ صورت بھی اختیار کرنے کے قابل نہیں۔

تیسری قسم طلاق کی وہ ہے جسے احسن کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ مرد عورت کو طہر میں بغیر اس کے کہ اس کے پاس گیا ہو طلاق دے یعنی ایک ہی مرتبہ اور یہی وہ طلاق ہے جو قرآن کریم کی آیات سے صاف معلوم ہوتی ہے اور جس کا پتہ احادیث سے بھی لگتا ہے اور یہی وہ طریق طلاق ہے جسے اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے طریق اختیار کر کے مسلمانوں کو اس قدر ذلت دیکھنی پڑی ہے کہ جس کا

يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ

دیا ہے(296) سوائے اس کے کہ دونوں کو ڈر ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ

بیان نہیں ہوسکتا اور قرآن شریف کی صراحت کے یہ خلاف ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے تو اسے مدت میں رجوع کا اختیار نہ رہے۔ دوسرے طریقوں کو اختیار کرنے کا نتیجہ ہی وہ حیوانیت کا طریق ہے جسے حلالہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

طلاق ایک ہی ہے خواہ سو دفعہ کہے یا تین دفعہ اور خواہ اسے روز کہتا جائے یا ہر ماہ میں ایک دفعہ کہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑسکتا۔ ہاں جب پہلی دفعہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالا ہے اس وقت سے عدت شروع ہوجاتی ہے بشرطیکہ عورت کی حالت طہر میں ایسا کہا ہو اور اگر طہر میں ایسا نہیں کہا تو جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ صحیح احادیث میں بتاتا ہے کہ رجوع کرنا پڑے گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے خود ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کرایا۔ باقی رہا یہ کہ حالت حیض کی طلاق ایک طلاق گنی جائے یا نہ۔ سو نبی کریم ﷺ کے فیصلہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طلاق نہیں گنی جائے گی۔ کیونکہ فرض کرو ایک شخص نے دو دفعہ اپنی بی بی کو طلاق دے کر رجوع کیا تیسری دفعہ حالت حیض میں وہ طلاق دیتا ہے تو اگر یہ طلاق سمجھی جائے تو رجوع ہو نہیں سکتا۔ حالانکہ نبی ﷺ نے رجوع کو ضروری ٹھہرایا کہ سوائے حالت طہر کے طلاق نہیں۔

طلاق میں حسن سلوک کا حکم:

طلاق کے مسئلہ میں ﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ﴾ نہایت اعلیٰ درجہ کا قانون ہے اس میں خاوند کی طرف سے بی بی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا حسن سلوک ضروری ٹھہرایا ہے اور حدیث میں ہے: [خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ] (جامع الترمذي، كتاب المناقب، باب فَضْلِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ: 3895) پس اگر طبائع میں کوئی ایسی ناموافقت ثابت ہو یا کوئی ایسے تنازعات پیدا ہوجائیں جن کی اصلاح نہیں ہوسکتی تو یہ چونکہ امساک بمعروف کے خلاف ہے اس لیے تسریح باحسان ضروری ہے یعنی عورت کے ساتھ کچھ احسان کر کے رخصت کر دینا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے اس کے کہ عورت کی طرف سے کسی فحش وغیرہ کا ارتکاب ہو اس کے ساتھ طلاق میں حسن سلوک کو قرآن کریم نے ضروری ٹھہرایا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خود بھی ایک موقعہ پر جب بیبیوں نے کچھ زیادہ اخراجات طلب کیے یہی حکم ہوا تھا کہ یہ دنیا کا مال چاہتی ہیں تو انہیں کہہ دو: ﴿اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الأحزاب: 28:33] ''میں تمہیں سامان دوں اور تمہیں اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔''

296- **مہر کی ادائیگی ضروری ہے:** ﴿مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ﴾ سے مراد مہر ہے کیونکہ مہر عورت کو دے دیا جاتا تھا۔ اور قرآن کریم نے جہاں کہیں مہر کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی رقم عورت کو ادا کر دی جاتی تھی۔ آج کل کی طرح ایک فرضی رقم نہ تھی۔ البتہ یہ جائز ہے کہ انسان کسی مجبوری کی وجہ سے فوراً اس رقم کو ادا نہیں کرسکتا تو اسے بطور قرضہ اپنے ذمہ سمجھے اور جس قدر جلد ممکن ہو ادا کرے۔ اور یہ طلاق پر چھٹی حد بندی ہے کیونکہ عموماً مہر کی رقم اس قدر ہوتی ہے کہ خاوند کو بلا وجہ طلاق دینے سے مانع ہوتی ہے اور مہر امیر اور غریب کی حیثیت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہے۔ آج کل جو لوگوں نے ایک فرضی شرعی

عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ

دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ میں دے دے۔[297] یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ پس ان سے آگے نہ

مہر بتیس روپیہ کا تجویز کیا ہوا ہے اس سے بہت قباحت پیدا ہو رہی ہے کیونکہ اس طرح پر جو ایک بڑا منشا مہر کا تھا کہ وہ طلاق کی آزادی پر روک رہے وہ باطل ہو گیا ہے اور مرد عورتوں کو جس طرح چاہتے ہیں، تکلیف دیتے ہیں۔ مہر کا کوئی حصہ واپس لینے کی صرف دو صورتیں ہیں جن میں سے ایک کا ذکر تو آگے آتا ہے اور دوسری کا ذکر سورہ نساء میں ہے: ﴿اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ [النسآء: 19:4] ''سوائے اس کہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔''

297- جس صورت طلاق کا ذکر یہاں ہے اسے اصطلاح شرعی میں خلع کہتے ہیں۔ یعنی وہ صورت جہاں عورت طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے مگر الفاظ یہ ہیں کہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب عورت کی طرف سے خواہش طلاق ہوگی تو یہ خطرہ ہے کہ مرد اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے زیادتی کرے اور یوں گویا دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں۔ عورت اس لیے کہ وہ طلاق چاہتی ہے اور مرد اس لیے کہ وہ زیادتی کرے گا اور اسے روکنے کی کوشش کرے گا۔ برخلاف پہلی صورت کے جہاں زیادتی صرف مرد کی طرف سے ہے یا خواہش طلاق صرف اسی کی طرف سے ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ میں حکام مراد ہیں۔ یعنی اگر عورت طلاق حاصل کرنا چاہے تو اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وہ اگر دیکھے کہ خلع ہونا چاہیے تو خلع کرا دے۔ گویا جس طرح مرد پر ایک بھاری روک مہر کی رقم ہے عورت پر طلاق حاصل کرنے میں روک یہ ہے کہ اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

جمیلہ کی طلاق کا واقعہ:

صحیح حدیثوں میں جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی اور اس کے خاوند ثابت بن قیس بن شماس کا ذکر موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا حق اسی طرح ہے جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے، جمیلہ طلاق چاہتی تھی اور قیس طلاق دینا نہ چاہتا تھا۔ جمیلہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم اس کا باغیچہ جو اس نے مہر میں دیا تھا واپس کر دو گی؟ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے قیس کو حکم دیا کہ طلاق دے دو۔ حدیث میں اس بی بی کے یہ لفظ موجود ہیں: [مَا أَعْتُبُ عَلَيْهِ فِيْ خُلُقٍ وَّلَا دِيْنٍ] (صحيح البخاري، كتاب الطلاق، باب الْخُلْعِ وَكَيْفَ الطَّلاَقُ فِيهِ: 5273) میں نہ اس کے اخلاق پر عیب لگاتی ہوں نہ دین پر۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں: [لَا أُطِيقُهُ (يعني) بُغْضًا] (سنن ابن ماجه، كتاب الطلاق، باب الْمُخْتَلِعَةِ تَأْخُذُ مَا أَعْطَاهَا: 2056) میں اس کو برداشت نہیں کرتی یعنی مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو مرد سے طلاق حاصل کرنے کا حق نہ صرف اس صورت میں حاصل ہے کہ اس کے اخلاق پر وہ عیب لگا سکے یعنی وہ اس سے بدسلوکی کرتا ہو یا دین پر عیب لگا سکے مثلاً جوزانی ہو یا فاسق یا فاجر ہو بلکہ محض ناموافقت

اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں۔(298)

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى پھر اگر وہ اسے (تیسری بار) طلاق دے تو وہ عورت اس

طبع کی وجہ پر بھی طلاق مل سکتی ہے۔ چونکہ عورت کو اس قدر وسیع حق طلاق حاصل کرنے کا دیا گیا۔ اس لیے جس طرح مرد کو طلاق میں جلدی کرنے کے متعلق فہمائش کی گئی ہے عورت کو بھی خصوصیت سے طلاق میں جلدی کرنے سے روکا گیا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے: [أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلاَقًا فِي غَيْرِ مَا بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ] (سنن أبي داؤد، كتاب الطلاق، باب فِي الْخُلْعِ: 2228) یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بلا کسی تکلیف کے طلاق مانگتی ہے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ناموافقت طبع خود ایک تکلیف ہے۔

ناموافقت طبع کو کیوں وجہ طلاق قرار دیا گیا ہے:

بظاہر خیال ہوگا کہ اسلام نے اس طرح پر عورتوں کو طلاق حاصل کرنے میں بہت آزادی دے رکھی ہے کیونکہ وہ محض ناپسندیدگی اور ناموافقت پر بھی ایک عورت کو طلاق دلا دیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم فطرت انسانی کے صحیح علم پر مبنی ہے۔ اگر مرد اور عورت میں ناموافقت ہے تو وہ نکاح کی غرض کو پورا نہیں کر سکتے کیونکہ ایک غرض نکاح کی یہ بھی ہے کہ میاں بی بی ایک دوسرے کا لباس بنیں، ایک دوسرے کے لیے تسکین اطمینان اور راحت کا موجب ہوں۔ جیسا ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ [البقرة: 187:2] ''وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔'' اور ﴿لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً﴾ [الروم: 21:30] ''تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا گیا ہے۔'' سے ظاہر ہے۔ وہ بصورت ناموافقت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اولاد کا پیدا کرنا اور اس کی تربیت جو ایک اور غرض ہے وہ بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ماں باپ کے جھگڑوں کا اثر اولاد کے اخلاق پر بہت برا ہوتا ہے۔

298- **ہندوستان میں عورت کی حق طلاق سے محرومی اور اس کے بدنتائج:** طلاق کے مسئلہ میں ایک بڑا بھاری ظلم جو ہندوستان میں عورتوں پر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کا حق طلاق حاصل کرنے کا سوائے بہت ہی محدود صورتوں کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ عورتوں کے ان حقوق سے جو قرآن شریف نے ان کو دیئے ہیں محروم کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہزارہا عورتیں بلکہ لاکھوں مصیبت اور درماندگی کی حالت میں ہیں جن کو خاوند نہ بساتے ہیں نہ چھوڑتے ہیں۔ پھر سینکڑوں عیسائی اور آریہ بن جاتی ہیں یا کوئی اور مذہب اختیار کر لیتی ہیں۔ محض اس لیے کہ خاوند کے ظلم سے نجات حاصل ہو۔ مگر ہمارے علما اور لیڈروں کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتا دیکھ کر خاموش ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے حق طلاق کے بعد کس قدر زجر کے الفاظ بھی فرمائے ہیں۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور ان سے آگے بڑھنے والے ظالم ہیں۔ مسلمان ان الفاظ پر غور کریں کہ خدائے تعالیٰ ان کو ان کے رویہ کے لحاظ سے کس گروہ میں داخل کرتا ہے۔

تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

کے بعد اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرلیں اگر ان کو یقین ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے (299) اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ انہیں ان لوگوں کیلئے کھول کر بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔

299- یہ طلاق کی آزادی پر ساتویں حد بندی ہے اصل میں پہلی دو طلاقیں عارضی علیحدگی ہیں۔ کیونکہ ان کے بعد میاں بی بی پھر پہلی صورت پر رہ سکتے ہیں لیکن اس عارضی علیحدگی کا فائدہ صرف دو دفعہ دیا ہے۔ کیونکہ اگر عارضی جدائی پر حد بندی قائم نہ کی جاتی تو یہ خود ایک بیماری بن جاتی اس لیے فرمایا کہ تیسری مرتبہ طلاق کا لفظ انسان خوب سوچ کر منہ سے نکالے کیونکہ پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس تعلق کو دوبارہ قائم کرنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ سوائے ایک صورت کے کہ وہ بی بی کسی اور خاوند سے نکاح کرے پھر وہ خاوند بھی اسے طلاق دے دے۔

ان الفاظ سے جو ایک مسئلہ حلالہ کا اخذ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام پر ایک اور بدنامی کا دھبہ ہو رہا ہے۔ عام رواج یہ پڑا ہوا ہے کہ جہاں کوئی شخص بیوی پر ناراض ہوا جھٹ تین طلاق کہہ دی بعد میں پچھتایا تو ملا صاحب نے حلالہ کا مسئلہ پیش کر دیا یعنی ایک رات کے لیے کسی دوسرے شخص سے ایک فرضی نکاح ہو جائے اور صبح کو وہ طلاق دے دے یہ ایک لعنت ہے جو مسلمانوں کے گلے پڑی ہے اس لیے کہ وہ خلاف قرآن چلتے ہیں۔ حلالہ کی رسم بھی دراصل ایک جاہلیت کی رسم تھی اور حدیث میں صاف نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے پر اور اس پر جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہے لعنت کی ہے۔ (مشکوٰۃ) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس حلالہ کرنے والا اور کرانے والا لایا جائے گا تو میں دونوں کو سنگسار کروں گا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا ہے تاکہ اس کے خاوند کے لیے حلالہ کرے۔ تو آپ نے نکاح کو فسخ کر کے دونوں کو الگ الگ کر دیا اور فرمایا کہ وہ پہلے خاوند کے پاس نہیں جا سکتی جب تک خوشی سے نکاح نہ کرے اور اس نکاح میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو۔ (روح المعانی) تو جس لعنت کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے دور کیا تھا وہ آج مسلمانوں کے گلے پڑی ہوئی ہے اور اس کو اتارنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

نکاح عارضی نہیں ہو سکتا:

اگر کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن شریف کے الفاظ سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے تو وہ اصول قرآنی سے بے خبر ہے۔ قرآن

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ
وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ
لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا
ع 29/3/13 اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو یا انہیں اچھی طرح سے رکھو یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کردو اور ان کو دکھ دینے کے لیے نہ روک رکھو تا کہ تم زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور اللہ کی باتوں سے ہنسی نہ کرو اور اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یاد کرو اور اس کو بھی جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری جس کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔(300)

شریف ایک رات یا مقرر وقت کے نکاح کو جائز ہی نہیں رکھتا۔ نکاح تو قرآن کریم کی اصطلاح میں وہی ہے جو زندگی بھر کے لیے ہو۔ پھر مرد و عورت کی رضامندی نکاح کے لیے ضروری ہے وہ حلالہ کے لعنتی طریق میں کہاں پائی جاتی ہے۔ یہ صریح زنا کاری ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے پورا زور لگائے۔

300- بَلَغْنَ۔ بُلُوْغٌ یا بَلَاغٌ۔ اصل میں تو کسی مقصد کے انتہا کو پہنچ جانے کا نام ہے مگر کبھی اس کے قریب پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (غ)

یہاں اختتام میعاد کے قریب پہنچنا ہی مراد ہے کیونکہ اگر واقعی میعاد کو پورا کرلیں تو پھر اَمْسِكُوْهُنَّ یعنی روک رکھنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

اَجَل۔ کسی چیز کے لیے جو وقت مقرر کردیا جائے وہ اس کی اجل کہلاتا ہے۔ (غ) یہاں مراد عورت کی عدت ہے۔ یہاں سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک طلاق ایک ہی ہے کیونکہ اس میں رجوع کا اختیار باقی ہے ورنہ عدت گزرنے کو ہو تو روک رکھنا بے معنی ہے۔

عورت کو خاوند کی طرف سے دُکھ ہو تو قاضی طلاق دلوا سکتا ہے:

دوسری بات جو اس آیت سے ظاہر ہے یہ ہے کہ عورت کو دکھ دینے کے لیے روک رکھنا ناجائز ہے۔ پس وہ تمام حالات جن میں عورتوں کو محض دکھ دینے کے لیے روک رکھنا ثابت ہو ایسے ہیں کہ قرآن شریف کے ماتحت قاضی طلاق دلوا سکتا ہے کثرت سے ایسے واقعات ہیں کہ جن میں خاوند یہ کہہ کر عورتوں کو معلقہ چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم نہ تمہیں طلاق دیں گے نہ بسائیں گے۔ یہ قرآن شریف کے ساتھ ہنسی ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں صاف فرمایا۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انہیں (اس بات سے) مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کرلیں، جب آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔ اس کے ساتھ تم میں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے یہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ اور بہت صفائی (کی بات) ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (301)

301- تَعْضُلُوْهُنَّ۔ عَضَلَ کے اصل معنی ہیں عُضْلَةٌ (سخت گوشت جو پٹھے میں ہوتا ہے) کے ساتھ باندھنا اس لیے سختی کے ساتھ روکنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (غ)

اَزْکٰی۔ اَطْهَرُ۔ ذَکَا کے معنی میں برکت اور نشوونما کا خیال غالب ہے اور طَهَرَ کے معنی میں نجاست وغیرہ مانع ترقی اشیاء سے پاک ہونا۔ [دیکھو نمبر: 66] و [نمبر: 285]۔

طلاق میں عدت گزرنے پر پہلے خاوند اور بیوی کا نکاح جائز ہے:

جس طرح طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح عدت گزر جانے پر بھی اسی خاوند اور بی بی کا نکاح بھی جائز ہے۔ چنانچہ یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت ایسے شخص کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بی بی کو ایک بار یا دو بار طلاق دے چکا ہو۔ پھر اس کی عدت گزر جائے تب وہ یہ چاہے کہ پھر اس سے نکاح کرے۔ صحیح بخاری میں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اسی معنی کی وضاحت کرتا ہے۔ معقل رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ کو ان کے خاوند نے طلاق دے دی۔ جب اس کی عدت گزر گئی تو پھر دوبارہ اس سے نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ معقل رضی اللہ عنہ نے انکار کیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تو معقل نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح پہلے خاوند سے کر دیا۔ بی بی رضامند تھی۔

تین طلاقوں کا عدم جواز:

یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ اکٹھی تین طلاقیں ناجائز ہیں کیونکہ طلاق کے بعد جو میاں بی بی کو پھر دوبارہ نکاح کر لینے کی اجازت اس آیت سے ملتی ہے وہ اکٹھی تین طلاقوں سے باطل ہو جاتی ہے اور اس کو جو اَزْکٰی اور اَطْهَرُ کہا تو یہ بھی ظاہر ہے کیونکہ اس کے خلاف کر کے حلالہ کا گند قبول کرنا پڑا۔

وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَاۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖؕ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ

اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرانا چاہتا ہے اور جس کا بچہ ہے اس پر اچھے طور پر ان کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔ کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالا جاتا مگر جہاں تک اس کی طاقت ہے نہ ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے اور وارث پر بھی ایسی ہی (ذمہ داری) ہے۔ پھر اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں،[302] اور اگر تم چاہتے ہو کہ اپنی اولاد کے لیے

302- یُرْضِعْنَ۔ تَسْتَرْضِعُوْا۔ اَرْضَعَ دودھ پلایا اور اِسْتَرْضَعَ دودھ پلانے والی کو رکھا۔

تَضَآرَّ۔ گو باب مفاعلہ ہے مگر اس باب میں بعض وقت ایک ہی مراد ہوتا ہے پس اس کے معنی ضرر پہنچانا ہی ہیں۔

﴿وَ عَلَى الْوَارِثِ﴾ عطف ہے وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ پر اور وارث سے مراد باپ کا وارث ہے یعنی باپ مر گیا ہو تو کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری اس کے وارث پر ہے۔

فِصَالًا۔ فصل ایک چیز کو دوسری سے علیحدہ کرنا اور فِصَالٌ بچہ کو دودھ پینے سے علیحدہ کرنا ہے۔

تَشَاوُرٍ۔ اس کا اصل شِرْتُ الْعَسَلَ سے ہے یعنی میں نے شہد نکالا۔ پس تشاور اور مشورۃ کے معنی ہیں بات کو ایک دوسرے کی طرف لوٹا کر استخراج رائے کرنا یعنی رائے کا نکالنا۔ (غ)

دودھ پلانے کی مدت:

طلاق کے مسائل میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال بالخصوص پیدا ہوتا ہے۔ مگر مسئلہ عام طور پر بیان کر دیا ہے۔ گو روٹی اور کپڑا بوجہ دودھ پلانے کے دینا صاف بتاتا ہے کہ اصل ذکر مطلقہ عورتوں کا ہی ہے۔ دودھ پلانے کی مدت دو سال بیان فرمائی ہے۔ مگر یہ حکم نہیں کہ ضرور اس عمر تک دودھ پلایا جائے کیونکہ خود اس آیت میں ہی فرمایا کہ اگر دونوں چاہیں تو دو سال سے پہلے دودھ چھڑا دیں۔ جیسے کہ مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں دو سال کی مدت دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ ہے اور دودھ پلانے سے جو حرمت رشتوں کی پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس کی میعاد ہے۔ دو سال سے زیادہ کے بچے کو دودھ پلانے سے حرمت پیدا نہیں ہوتی گویا

فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَیۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۳﴾

(اور) دودھ پلانے والی رکھ لوتو تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ جو تم نے دینا تھا عمدگی سے پورا دے دو اور اللہ کا تقویٰ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔ (302)

وَ الَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَ یَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا یَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّ عَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا فَعَلۡنَ فِیۡۤ

اور تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ

ضمناً یہاں اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔

اور دوسری جگہ جو فرمایا: ﴿وَحَمۡلُہٗ وَفِصٰلُہٗ ثَلٰثُوۡنَ شَہۡرًا﴾[الأحقاف: 15:46] جس میں حمل اور دودھ چھڑانے کی میعاد اڑھائی سال قرار دی ہے تو یہ اس کے خلاف نہیں اس لیے کہ ادنیٰ مدت حمل چھ ماہ ہے اور اس لیے بھی کہ وہاں ماں کی تکلیف کا ذکر ہے اور حمل کا بوجھ چوتھے مہینہ میں ہی شروع ہوتا ہے اور یوں حمل کی تکلیف چھ ماہ اور دودھ پلانا دو سال کل اڑھائی سال ہوئے۔

302- سَلَّمۡتُمۡ ۔ تَسۡلِیۡمٌ کا مادہ بھی اِسۡلَامٌ کی طرح سَلَمٌ ہے اور سَلَمٌ اور سَلَامَۃٌ تو ظاہری اور باطنی آفات سے محفوظ ہونا ہے۔ (غ) اور سَلَّمَ کے معنی وَقَاہُ ہیں یعنی اسے بچایا۔ (ت) جیسے: ﴿وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ﴾[الأنفال: 43:8] ''لیکن اللہ نے بچا لیا۔'' اور سَلَّمۡتُہٗ اِلَیۡہِ کے معنی ہیں میں نے اس کو دے دیا۔ (ت) اور یہی معنی سَلَّمۡتُمۡ کے یہاں ہیں اور تَسۡلِیۡمٌ اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر پر راضی رہنے کو بھی کہتے ہیں اور حکم کی پوری پوری فرمانبرداری کو بھی۔ جب اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے۔ (ت) جیسے: ﴿ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَ یُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا﴾[النسآء: 65:4] ''پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور پوری پوری فرمانبرداری کریں۔'' اور تَسۡلِیۡمٌ سلام کہنے کو بھی کہتے ہیں اور وہ دعا ہے کہ ایک شخص اپنے دین اور نفس میں آفات سے بچا رہے۔ (ت) ﴿فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُیُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ﴾[النور: 61:24] ''پس جب تم اپنے گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کہا کرو۔''

اٰتَیۡتُمۡ ۔ اِیۡتَآءٌ کے اصل معنی دینا ہیں۔ مَآ اٰتَیۡتُمۡ سے مراد عورت کا مہر ہے [دیکھو نمبر: 296] خواہ دے دیا ہو یا ابھی دینا ہو۔ مراد یہ ہے کہ کسی دوسری دودھ پلانے والی کے رکھنے سے مطلقہ کے حقوق میں کوئی کمی نہ ہو یا اس کے مہر کا کوئی حصہ واپس نہ لیا جائے۔

اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اپنے حق میں پسندیدہ طریق پر کریں۔ اور جو تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خبردار ہے۔ (303)

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ

اور اس کے لیے تم پر کوئی گناہ نہیں جو تم اشارۃً (بیوہ) عورتوں کو پیغام نکاح دو یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا خیال رکھو گے لیکن ان سے خفیہ وعدہ مت کرو ہاں پسندیدہ بات بے شک کہو۔ اور نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو یہاں تک کہ مقرر کیا ہوا وقت اپنی انتہا کو پہنچ

303- يُتَوَفَّوْنَ۔ مادہ وَفٰی جس کے معنی ہیں بُلُوْغُ التَّمَامِ۔ (غ) یعنی انتہا کو پہنچ جانا۔ وَفِی الْعَهْدِ اور اَوْفٰی کے معنی ہیں عہد کو پورا کیا اور تَوْفِيَةٌ کے معنی پورا دینا اور اِسْتِيْفَاءٌ کے معنی پورا لینا ہیں۔ (غ) چنانچہ ﴿وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ [آل عمران: 25:3] ''ہر ایک جان کو پورا دیا جائے گا۔'' ﴿تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ﴾ [آل عمران: 185:3] ''تم کو تمہارے پورے اجر دیئے جائیں گے۔'' ﴿تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ﴾ [البقرة: 281:2] ''ہر شخص کو پورا دیا جائے گا۔'' میں وَفٰی کے معنی (جو تَوفِيَةٌ یعنی باب تفعیل سے ہے) پورا دے دیا: [وَقَدْ عُبِّرَ عَنِ الْمَوْتِ وَالنَّوْمِ بِالتَّوَفِّيْ]۔ (غ) یعنی توفی (باب تفعل) سے مراد موت اور نیند ہے اور موت اور نیند میں امر مشترک قبض روح ہے سو یہی معنی توفی کے ہیں اور اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کے معنی قَبَضَ رُوْحَهُ ہی ہیں یعنی اس کی روح قبض کر لی نہ کچھ اور۔

يَذَرُوْنَ مادہ ذَرْ ہے مگر اس سے ماضی نہیں آتی مضارع اور امر ہی آتے ہیں۔ اور اس کی مصدر بھی استعمال میں نہیں آتی بلکہ اس کی جگہ لفظ تَرْكٌ استعمال کرتے ہیں جو اس کے ہم معنی ہے یعنی چھوڑ دینا۔

کچھ مسائل طلاق کا ذکر ابھی باقی ہے اور درمیان میں تعلق دکھانے کے لیے بیوہ عورتوں کا ذکر کر دیا ہے اور کچھ ذکر بیوہ عورتوں کا پھر بعد میں آئے گا۔

بیوہ کی عدت چار ماہ اور دس یوم ہیں لیکن حمل ہو تو اس کی عدت دوسری جگہ مذکور ہے اور وہ وضع حمل تک ہے خواہ چار ماہ سے کم ہو یا زیادہ [الطلاق: 4:65] اپنے بارہ میں پسندیدہ طریق سے کچھ کرنے سے مراد یا نکاح ہے یا نکاح کی غرض سے زینت وغیرہ کرنا۔ یہاں بیوہ عورت کے نکاح کرنے کو امر معروف قرار دیا گیا ہے۔ جو مسلمان ہندوؤں کی طرح اس سے عار کرتے ہیں وہ قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف کرتے ہیں۔ ﴿فِيْمَا فَعَلْنَ﴾ میں فعل کو خود ان کی طرف منسوب کرنے میں اشارہ یہ معلوم

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع 30 4 14

جائے اور جان لو کہ اللہ اسے جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے خبردار رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔(304)

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو جب کہ تم

ہوتا ہے کہ وہ اپنے نکاح کی خود مختار ہیں۔

304- عَرَّضْتُمْ۔ عَرَضٌ سے ہے تعریض ذو وجہین کلام کو کہتے ہیں جو صدق پر بھی محمول ہوسکتی ہے اور کذب پر بھی یا ظاہر پر بھی محمول ہوسکتی ہو اور باطن پر بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر لفظوں میں پیغام نہ دے کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں البتہ ایسے لفظ کہہ دے جیسے یہ کہ تم جمیلہ ہو یا مرغوب ہو۔ جس سے اشارہ پایا جاتا ہو تو حرج نہیں اور یہ حکم صرف ایام عدت کے لیے ہے۔

خِطْبَةٌ۔ خَطَبَ کلام میں مراجعت کو کہتے ہیں اور خُطْبَةٌ وہ کلام ہے جس میں وعظ ہو اور خِطْبَةٌ وہ جس کا مقصد نکاح کے لیے عورت سے درخواست کرنا ہو۔ (غ)

اَكْنَنْتُمْ۔ كِنٌّ وہ ہے جس میں ایک شے کی حفاظت کی جائے اور اس کی جمع اَكْنَانٌ ہے: ﴿وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا﴾ [النحل: 81:16] ''اور تمہارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنائیں۔'' اور كَنَنْتَ کے معنی ہیں كِنٌّ میں کر دیا یا محفوظ کر دیا جیسے: ﴿لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ﴾ [الطور: 24:52] ''پردے میں رکھے ہوئے موتی ہیں۔'' ﴿بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ﴾ [الصّٰفّٰت: 49:37] ''محفوظ کیے ہوئے انڈے ہیں۔''، ﴿كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ﴾ [الواقعة: 78:56] ''محفوظ کتاب۔'' اور اَكْنَنْتُ دل میں چھپانے سے مخصوص ہے اور ﴿وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾ [الأنعام: 25:6] [بني إسرائيل: 46:17]، [الكهف: 57:18] ''اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ اسے سمجھیں نہیں۔'' میں اور ﴿قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ﴾ [حٰمٓ السجدة: 5:41] ''ہمارے دل پردوں میں ہیں۔'' میں اَكِنَّةٌ كَنَانٌ کی جمع ہے اور وہ وہ پردہ ہے جس میں ایک چیز چھپائی جائے۔ (غ)

سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ ذِكْرٌ کے ایک معنی کسی چیز کا خیال دل میں کرنا بھی ہیں۔ (غ)

كِتَابُ۔ یہاں بمعنی مَا كُتِبَ ہے اور كُتِبَ کے معنی فُرِضَ ہیں۔ کیونکہ کتاب کے معنی فرض کر دینا بھی آتے ہیں اور مراد عدت ہے جو فرض کی گئی ہے۔

عدت میں بیوہ کو پیغام:

بیوہ کی عدت کے اندر نہ اس سے صراحتاً نکاح کا ذکر کرنا جائز ہے نہ نکاح کا فیصلہ کرنا۔ اشارہ کے طور پر جتا دینا جائز ہے۔

لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

نے ابھی ان کو چھوا نہ ہو یا مہر مقرر نہ کیا ہو اور ان کو کچھ سامان دو۔ فراخی والا اپنی قدر کے موافق اور تنگ دست اپنی قدر کے مطابق اچھے طریق پر نفع پہنچانا ہے یہ نیکی کرنے والوں پر ایک حق ہے۔[305]

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

اور اگر تم ان کو طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم نے ان کو

305- تَمَسُّوْهُنَّ۔ مَسٌّ چھونا اور کنایۃً عورت کے پاس جانے پر بولا جاتا ہے۔(غ)

تَفْرِضُوْا۔ فَرِيضَةٌ چونکہ کسی چیز پر عمل واجب کر دینا بھی فرض ہے [دیکھو نمبر: 253] پر فَرِيضَةٌ وہ مہر ہے جو واجب کر دیا گیا اور تَفْرِضُوْا اس کے مقرر کرنے پر کہا گیا ہے اَوْ تَفْرِضُوْا میں اَوْ بمعنی "وَ" یا "حَتّٰی" ہے۔

مَتِّعُوْهُنَّ۔ مَتَاعٌ ایک لمبے وقت تک نفع پہنچانا ہے۔ یہاں مراد اس سے وہ چیز ہے جس سے مطلقہ اپنی عدت میں فائدہ اٹھائے۔

مُقْتِرُ۔ قَتَرَ۔ اسراف کے مقابل پر ہے تھوڑا خرچ کرنے کو کہتے ہیں جیسے: ﴿لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا﴾ [الفرقان: 67:25] ''نہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ (موقع پر) تنگی کرتے ہیں۔'' ﴿كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: 100:17] ''انسان تنگ دل ہے۔'' یعنی بخیل اور مُقْتِرُ تنگ دست کو کہتے ہیں اور قَتَرَ دھوئیں کو کہتے ہیں جو بھنے ہوئے گوشت یا لکڑی وغیرہ سے اٹھتا ہے اور وہ بھی ایک قلیل یا غیر نافع چیز ہوتی ہے۔(غ)

طلاق قبل از تقرر مہر:

یہاں اس حالت کا ذکر ہے جب میاں بی بی میں خلوت نہیں ہوئی بلکہ مہر بھی مقرر نہیں ہوا (اس سے معلوم ہوا کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو تو نکاح باطل نہیں ہوتا۔ البتہ خلوت سے پہلے مہر کا مقرر ہو جانا یا دیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔) اس صورت میں اگر طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے تو مہر نہیں دیا جائے گا (اور عدت بھی کوئی نہیں جیسے دوسری جگہ مذکور ہے یعنی عورت کا نکاح دوسری جگہ فوراً طلاق کے بعد ہو سکتا ہے۔) لیکن ایسی صورت میں بھی کچھ سامان دینا ضروری ہے وہ رقم حالات کے لحاظ سے ہوگی۔ امیر کے لیے زیادہ غریب کے لیے کم۔ خواہ انسان خود دے دے یا حاکم مقرر کر دے۔ یہ محسنوں یا نیکی کرنے والوں پر بالخصوص ایک حق ہے اور گویا عورت کی دل شکنی کے لیے ایک معاوضہ ہے۔ لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ چونکہ طلاق دینے سے بہت کثرت سے روکتے تھے اس لیے لوگوں کو گمان ہوا کہ ایسی صورت میں تو طلاق ناجائز ہوگی تو یہ آیت اتری کیونکہ فی الواقع حالات انسانی کے بے حد اختلافات میں ایسی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔

وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

چھوا ہو اور تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس کا آدھا دے دو جو مقرر کیا ہو، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (اپنا حق) معاف کر دے اور یہ کہ تم (مرد) معاف کرو تقویٰ سے بہت نزدیک ہے اور آپس میں نیک سلوک کرنا نہ بھلاؤ جو تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔ (306)

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

تم اپنی نمازوں اور درمیانی نماز کی محافظت کرو اور اللہ کے فرمانبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ (307)

306- ﴿الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ چونکہ طلاق دینے یا عقد نکاح کو کھولنے کا مجاز خاوند ہے اس لیے اس سے مراد خاوند ہی ہے اور یہی تفسیر نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔ (ث۔ج)

اَلْفَضْلُ۔ وہ عطیہ جس کا دینا دینے والے پر لازم نہیں۔ [دیکھو نمبر: 137]۔ پس یہاں فضل ترک نہ کرنے سے مراد ہوئی ایسے عطایا کا دینا جس کو ہماری زبان میں سلوک کرنا کہتے ہیں۔

طلاق قبل از خلوت جب مہر مقرر ہو چکا ہو:

خلوت نہیں ہوئی اور مہر مقرر ہو چکا ہے تو طلاق پر نصف مہر ادا کرنا ہوگا لیکن اس صورت میں عورت کو اختیار ہے کہ بغیر خلع کے بھی چاہے تو مہر چھوڑ سکتی ہے۔ لیکن زور اسی بات پر دیا ہے کہ رعایت حقوق یہ چاہتی ہے کہ مرد ہی اپنا حق معاف کریں یعنی اس صورت میں نصف نہیں بلکہ پورا مہر دے دیں۔ جیسا جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بی بی سے نکاح کیا اور قبل خلوت کے طلاق دے دی تو سارا مہر ادا کیا اور فرمایا کہ مجھ پر زیادہ حق ہے کہ میں اپنے حق کو چھوڑ دوں۔

307- مُحَافَظَةٌ۔ حَافِظُوْا باب مفاعلہ سے ہے۔ مفردات میں ہے کہ باب مفاعلہ کے استعمال میں یہ تنبیہ ہے کہ نماز پڑھنے والے نماز کی حفاظت کرتے ہیں اس کے اوقات کو نگاہ رکھتے ہوئے اور اس کے ارکان کی رعایت کرتے ہوئے اور پورے زور کے ساتھ اس کے قیام میں کوشش کرتے ہوئے اور نماز ان کی حفاظت کرتی ہے وہ حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ نماز بے حیائی اور بدی سے بچاتی ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ [العنکبوت: 45:29] ''نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روک دیتی ہے۔''

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ

پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیدل یا سوار (جس طرح ہو نماز پڑھ لو)[308] پھر جب امن میں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح

الوُسْطٰی۔ وَسْطٌ کا استعمال کبھی مکان کے لحاظ سے ہوتا ہے اور کبھی درجہ کے لحاظ سے۔ یعنی جو چیز افراط وتفریط سے محفوظ ہو کر میانہ ہو۔ (غ) گویا اعلیٰ درجہ کی چیز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس چیز پر بھی جو دوسری دو چیزوں کے درمیان ہو۔

مسائل طلاق کے ذکر میں نماز کا ذکر بے ربط خیال کیا جاتا ہے۔ ذیل کے امور ربط بتاتے ہیں:

1. اول اصل ذکر جنگ کا تھا اور طلاق کے مسائل بھی اسی ذیل میں آئے تھے اور یہاں بھی بالخصوص جنگ کی نماز کا ذکر ہے۔ جیسے اگلی آیت سے ظاہر ہے۔
2. دوم طلاق کے مسائل میں بار بار تقویٰ کی ہدایت کی ہے۔ نماز تقوی اللہ کی کنجی ہے۔ اس لیے اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے۔
3. سوم یہ بتانا مقصود ہے کہ نکاح طلاق وغیرہ سب فروعی مسائل ہیں۔ اصل جڑ نیکیوں کی نماز ہے۔ پس تعلقات دنیوی میں پھنس کر ذکر الٰہی سے غافل نہیں ہو جانا چاہیے۔

صلوٰۃ الوسطی نماز عصر ہے:

الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی کے متعلق بہت بحث ہوئی ہے۔ بخاری میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: [حَبَسُونَا عَنْ صَلاةِ الْوُسْطَى حَتّٰى غَابَتِ الشَّمْسُ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى): 4533) یعنی (خندق کے دن کفار نے) ہمیں وسط کی نماز سے روک رکھا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے نماز عصر کو صلوٰۃ وسطی فرمایا ہے۔ یہ بلحاظ وقت بھی درمیان میں ہے اور بلحاظ مرتبہ بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ کیونکہ کاروبار کا وقت ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیں پانچ ہیں۔ کیونکہ صلوات جو جمع ہے تین یا زائد پر بولا جائے گا مگر ایک نماز کے وسط میں ہونے کے لیے تعداد جفت چاہیے یعنی کم از کم چار نمازیں اور ہونی چاہئیں۔

308- رُكْبَانًا۔ رُكْبَانٌ۔ رَاكِبٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سوار اور رکوب اصل میں حیوان کی پیٹھ پر چڑھنے کا نام ہے اور پھر ہر سواری پر بولا جاتا ہے۔ جیسے کشتی یا ریل۔ رِجَالًا۔ رِجَالٌ۔ رَجُلٌ یا رَاجِلٌ کی جمع ہے جس کے معنی پیادہ چلنے والا۔ کیونکہ رِجْلٌ پاؤں کو کہتے ہیں۔

حالت خوف میں نماز:

جب نماز کی حفاظت کے لیے تاکید فرمائی تو یہ بھی بتا دیا کہ نماز ترک کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ کسی قسم کا خوف ہو، دشمن کا خوف ہو یا کوئی اور مثلاً یہی کہ انسان ریل پر سوار ہے اور خوف ہے کہ اتر کر نماز پڑھے تو ریل چلی جائے۔ تو فرمایا کہ

مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اس نے تمہیں سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے۔(309)

حالت خوف میں بھی نماز ترک نہ کرو۔ ہاں جس حالت میں ہو اسی حالت میں پڑھ لو۔ یہاں تک کہ اگر انسان پیدل چل رہا ہے اور ٹھہرنے میں خوف ہے تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے اور گھوڑے یا گاڑی یا کشتی یا ریل پر سوار ہے تو اسی حالت میں پڑھ لے۔ مگر نماز ترک نہ کرے۔ کتنے مسلمان ریل میں سفر کرتے ہیں اور بالکل فارغ ہوتے ہیں مگر نماز نہیں پڑھتے۔ جو حکم اس قدر مؤکد تھا اس کی آج کیا گت بنی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک نماز سے بڑھ کر غیر ضروری چیز ہی کوئی نہیں۔

خوف میں نماز باجماعت:

دشمن سے خوف کی حالت بھی یہاں آجاتی ہے۔ گو [النسآء: 101] میں دشمن کے فتنہ کا صریح الفاظ میں ذکر ہے مگر ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں پھر بھی جمع ہو کر نماز پڑھنے کی صورت باقی ہے۔ یہاں ایسی صورت نہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ خوف اس سے بھی زیادہ ہے۔ بالفاظ دیگر جب تک دشمن سے خوف کی صورت میں اجتماع کی حالت میں نماز پڑھنا ممکن ہو [النسآء: 101] کے مطابق پڑھی جائے۔ اگر اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر جس طرح انسان پڑھ سکے پڑھ لے۔ پیدل چلتا ہوا، سوار سواری کی حالت میں۔ اسی کی تائید میں بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ ہیں جو اس حدیث کے آخر میں ہیں جس میں ایک ایک رکعت نماز باجماعت پڑھنے کا اور دوسری اپنی جگہ پوری کرنے کا ذکر ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو تو پھر پیدل یا سوار قبلہ کی طرف یا غیر قبلہ کی طرف جس طرح ہو نماز پڑھ لو۔

309- اٰمِنْتُمْ۔ اَمْنٌ کے اصل معنی ہیں خوف کا جاتے رہنا اور اطمینان نفس یعنی بے آرامی کے بعد سکون کا ملنا۔ (غ)

نماز ذکر اللہ کی بہترین صورت ہے:

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ ذکر کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 191]۔ اللہ کی یاد، یا اللہ کی ثناء کو یہاں نماز کے قائمقام رکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں نماز ہی اللہ تعالیٰ کے ذکر کی اعلیٰ سے اعلیٰ صورت ہے۔

اہل قرآن کی غلطی:

جب خوف کی حالت کا ذکر کیا کہ اس میں جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو تو ساتھ ہی امن کی نماز کا بھی ذکر فرمایا کہ پھر وہ اس تعلیم کے مطابق ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ امن کی نماز کی صورت اللہ تعالیٰ اس سے پہلے مسلمانوں کو سکھا چکا تھا۔ مگر تعجب ہے کہ جو لوگ اہل قرآن کہلاتے ہیں وہ اس ارشاد خداوندی کے صریح خلاف نماز خوف سے نماز امن کے احکام کا قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ نماز تو مکہ میں ہی فرض ہوئی تھی جہاں بہرحال اس قسم کا خوف دشمن سے کوئی نہ تھا اور یہ ناممکن ہے کہ نماز کی فرضیت تو مکہ میں ٹھہرائی گئی ہو لیکن یہ نہ بتایا گیا ہو کہ وہ نماز کس طرح ادا کرنی ہے؟ بلکہ اس کے لیے مسلمانوں کو اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب جنگیں شروع ہو جائیں اور پھر خدائے تعالیٰ نماز خوف کی صورت بتائے تب وہ اس سے نماز امن کا قیاس کریں۔ لیکن اس آیت نے فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ فرمایا کہ نماز امن تو ہم تم کو سکھلا چکے ہیں مگر اس کی تفصیلات تو قرآن شریف میں موجود نہیں۔

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

اورتم میں سے جو مرجائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں اپنی عورتوں کے لیے وصیت کرجائیں کہ ایک سال تک گھر سے نکالے بغیر خرچ دیا جائے۔ پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔(310)

پس ثابت ہوا کہ یہ تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی خفی سے آنحضرت ﷺ کو دی اور آپ نے آگے لوگوں کو یہ تعلیم دی۔ نبی کریم ﷺ کی اس تعلیم کو اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف منسوب کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ بھی وحی الٰہی سے تھی۔ مگر چونکہ وہ وحی متلو قرآن شریف میں تو ہے نہیں اس لیے اسے وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ خدا کی وحی سے تھا۔ وحی کی اقسام کے لیے دیکھو [الشوری: 51]۔

نماز کی تفصیلات قرآن میں برنگ اشارہ:

اور اگر یہ کہا جائے کہ اشارات کے رنگ میں نماز کی رکعات ارکان وغیرہ کا ذکر قرآن شریف میں پہلے بھی ہو چکا تھا تو اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن ان اشارات سے کوئی شخص نماز کی ایک صورت قائم نہیں کرسکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ نماز کی ساری تفصیلات کو قرآن کریم میں ہی بیان فرمادے تو جس طرح روزوں کا ذکر ایک جگہ کردیا۔ طلاق وغیرہ کے احکام کا ذکر ایک جگہ کردیا اور ان باتوں کو اشاروں پر نہیں چھوڑا۔ اس طرح نماز اس کے ارکان، اس کی رکعات، اس کے اوقات، اس کی ترتیب کا بھی ذکر بصراحت ایک جگہ کردیتا اور یا اگر اشارات ہی دینے تھے تو باقی احکام کے متعلق بھی اشارات ہی ہوتے۔ حالانکہ اگر دوسرے احکام اشارات میں بھی ہوتے تو حرج نہ تھا وہ فروعی امور تھے اور نماز کو تو عملی رنگ میں اصول دین میں سے قرار دیا ہے اور یہ ہر مومن کو روزانہ پانچ وقت پڑھنی ضروری ہے اور کوئی حکم ایسا نہیں جس کا اس قدر تعلق ہر انسان کی زندگی سے ہو کہ بار بار روز دہرایا جائے۔ پس حق یہی ہے کہ نماز کی اصل ہیئات چونکہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور اس کی تفصیلات بہت بسط کی محتاج تھیں۔ اس لیے ان تمام باتوں کو اپنی وحی خفی سے نبی کریم ﷺ پر ظاہر کرکے تمام امت کو اس طریق پر تعلیم دے دی اور پھر یہ بھی بتادیا کہ یہ نماز ہماری سکھائی ہوئی نماز ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تجویز کردہ نہیں ہے۔

310- وَصِيَّةً۔ نَصَبَ کی تقدیر یوں ہے: [يُوْصُوْنَ وَصِيَّةً] یا [كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَصِيَّةً] اور ایک قراءت [كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْوَصِيَّةُ] جو اس کی مؤید ہے۔

بیوہ کے ایک سال متاع کا حکم آیت ورثاء کے خلاف نہیں:

اس آیت کے معنی ایسے صاف ہیں کہ اس کو منسوخ قرار دینے پر تعجب آتا ہے اس رکوع کا اصل مضمون مطلقہ اور بیوہ عورتوں سے

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو پسندیدہ طور پر فائدہ پہنچانا چاہیے یہ متقیوں پر ایک حق ہے۔

احسان ہے۔ پہلی اور آخری آیتوں میں مطلقہ کو متاع دینے کا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے اس میں بیوہ کو متاع دینے یا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے۔ یہ قیاس کہ اس کو ورثہ کی آیت نے بیوہ کو حصہ وراثت دے کر منسوخ کر دیا اس لیے غلط ہے کہ جب مطلقہ کو مہر سے علاوہ متاع یا سامان دینے کا حکم ہے جیسا کہ آگے آتا ہے تو بیوہ کو حصہ وراثت کے ساتھ متاع دینے کے حکم میں کیا حرج ہے؟ مطلقہ کا متاع عدت تک کا خرچ ہے بیوہ کی حالت اس سے زیادہ بے کسی کی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کو عدت سے کچھ زیادہ متاع کا حکم دیا اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ممکن ہے حمل ہو تو اس صورت میں نو دس ماہ حمل کے اور ایک دو ماہ اس کے بعد تکلیف کے کل ایک سال بن جاتا ہے اور مطلقہ کے لیے بھی تو حکم ہے کہ اگر حمل ہو تو وضع حمل تک اس کے اخراجات برداشت کیے جائیں[الطلاق: 6]۔

اسی طرح یہ آیت [آیت نمبر: 234] کے مضمون کے بھی خلاف نہیں کیونکہ وہاں بیوہ کی عدت چار ماہ دس یوم بتائی ہے۔ تو یہاں عدت کو منسوخ نہیں کیا بلکہ یہاں متاع کا ذکر ہے جو بیوہ کو دیا جائے گا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ متاع اسی صورت میں ہے جب بیوہ نکاح نہ کرے۔ کیونکہ جب نکاح کر لے گی تو پھر اس کا دوسرا کفیل پیدا ہو جائے گا۔ اسی لیے اس آیت میں صاف فرما دیا ہے کہ اگر بیوہ عدت پوری کر کے خود نکل جائے اور نکاح کر لے تو پھر اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ﴿فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ﴾ [البقرة: 240:2] ''جو انہوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے۔'' میں صاف نکاح کی طرف اشارہ ہے۔ پس وصیت صرف عورت کی ضرورت کے لیے ہے۔ اگر اس کو ضرورت نہیں تو وہ اختیار رکھتی ہے کہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔

نسخ اور عدم نسخ کے اقوال:

رہا یہ کہ روایات میں اس آیت کی منسوخی کا ذکر ہے تو ساتھ ہی اس کی عدم منسوخی کا بھی ذکر ہے۔ اول تو جب تطبیق معنی ہو گئی تو خواہ کسی صحابی کا بھی قول ہو کہ یہ آیت منسوخ ہے اور وہ روایت صحیح نہیں مانی جائے گی اور اگر اس کو صحیح مانا جائے، تو صحابی کی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ دوسرے جب دو متضاد اقوال موجود ہوں تو کیا وجہ ہے کہ منسوخی کے قول کو صحیح مانا جائے اور غیر منسوخی کے قول کو صحیح نہ مانا جائے۔ چنانچہ جہاں ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا قول منسوخی کے متعلق ہے وہیں بخاری میں مجاہد کا قول غیر منسوخی کا موجود ہے جو فرماتے ہیں کہ پہلے [آیت نمبر: 234] نازل ہوئی اور وہ عدت اس کے خاوند کے اہل کے نزدیک گنی جاتی تھی: [فَأَنْزَلَ اللّٰهُ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۙ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا) إِلَى (بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ): 4531) یعنی اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ پس جب یہ آیت بعد میں نازل ہوئی تو اس کا منسوخ ہونا بے معنی ہے۔ پھر اس کا نزول ہی بے معنی ہے کیونکہ جس آیت کو ناسخ کہا جاتا ہے وہ پہلے نازل ہو چکی تھی پھر مجاہد نے صاف الفاظ میں اسے غیر منسوخ بھی قرار دیا

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع 31 7 15

اسی طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (311)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

کیا تو نے ان کے حال پر غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل پڑے اور وہ ہزاروں تھے۔ پس اللہ نے ان کو فرمایا کہ تم مرجاؤ۔ پھر ان کو زندہ کیا یقیناً اللہ لوگوں پر بڑے فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (312)

ہے۔ جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض عورت کو اختیار دیا گیا ہے وہ چاہے اس سے فائدہ اٹھائے چاہے نہ اٹھائے۔ پس یہ منسوخ کیونکر ہوئی۔ بلکہ نسخ کے قول کو لاکر پھر عدم منسوخی کے دلائل لانے سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنا مذہب بھی عدم نسخ کا ہی ظاہر کیا ہے۔

اور حدیث [لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ] (سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی الوصیة للوارث، حدیث: 2872) بھی جو خود احاد میں سے ہے قرآن کریم کی اس صریح تعلیم کی ناسخ نہیں ہوسکتی بلکہ خود اس حد بندی کے ماتحت مانی جائے گی جو قرآن شریف نے یہاں کردی۔ یعنی بیوہ کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ اور مکان کی وصیت جائز ہے۔ البتہ تعامل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کے رنگ میں نہیں بلکہ محض سفارش کے رنگ میں فرمایا گیا ہے یا اجازت کے رنگ میں کہ اگر خاوند ایسی وصیت کرے تو جائز ہے۔

311- ان آیات سے ثابت ہے کہ ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کو سامان دینا چاہیے اور یہ مزید بطور احسان ہے۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق کی پوری رعایت کرنے والے ہیں ان پر یہ بھی ایک حق ہے اس لیے فرمایا: ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ [البقرة: 180:2] ''یہ متقیوں پر لازم ہے۔''

312- اَلَمْ تَرَ تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس واقعہ پر استعمال ہوتا ہے جو کمال شہرت حاصل کر چکا ہو۔ اور مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اس امر پر غور کرے کیونکہ رؤیت جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے، کئی طرح پر ہے۔ آنکھ سے، تخیل سے، فکر سے، عقل سے اور لکھا ہے کہ صلہ الیٰ ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ایسی نظر جس سے اعتبار یعنی غور کرنا مقصود ہو۔ ابن جریر نے بھی اس کو رؤیۃ القلب ہی قرار دیا ہے۔

دِيَارٌ۔ دَارٌ کے جمع ہے اور دار منزل کو کہتے ہیں یعنی جہاں کوئی شخص رہتا ہے۔

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ سننے والا

اُلُوْفٌ۔ اَلْفٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہزار ہیں۔ کیونکہ اَلْفٌ ایسے اجتماع کو کہتے ہیں جس میں اتحاد ہو۔ اور ہزار میں گویا اعداد کا اجتماع ہوتا ہے۔ (غ) ابن زید اُلُوْفٌ کو اٰلِفٌ کی جمع قرار دے کر اس کے معنی مؤلفۃ القلوب کرتے ہیں۔ (ر) یعنی ﴿هُمْ اُلُوْفٌ﴾ کے معنی ہوئے وہ اجتماع واتحاد کی حالت میں نکلے یا قوم کی قوم یا جماعت کی جماعت نکل پڑی۔

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج اور اس کا ذکر قرآن کریم میں:

اصل مضمون ضرورت جنگ پر ہے اگلی آیت میں یہ صراحت ہے اور سارے رکوع کا مضمون یہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوم تھی جو گھروں سے نکلی؟ مفسرین کہتے ہیں: داوردان کے رہنے والے تھے، طاعون سے بھاگے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مار کر پھر زندہ کیا تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ دوسرا قول ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی ان کے بادشاہ نے ان کو جہاد کی طرف بلایا انہوں نے انکار کیا۔ خدا نے انہیں آٹھ دن تک مار کر پھر زندہ کیا۔ تاریخی ثبوت ان میں سے کسی کا نہیں۔ البتہ دوسری توجیہ مضمون رکوع کے مطابق ہے مگر اَلَمْ تَرَ بتاتا ہے کہ یہ کوئی بڑا مشہور واقعہ ہے اور یہ واقعہ جو مفسرین نے لکھا ہے نہ صرف غیر مشہور ہے بلکہ اس کی اصلیت ہی کوئی نہیں۔ وہ واقعہ جس کی طرف قرآن کریم نے توجہ دلائی ہے کوئی مشہور تاریخی واقعہ ہونا چاہیے فی الحقیقت ایسا ہی ہے۔ اور خَرَجُوْا کا استعمال اس کی تعیین کرتا ہے کیونکہ ساری تاریخ میں خروج کا ایک ہی واقعہ ہے جس کو سب لوگ جانتے ہیں۔ یعنی بنی اسرائیل کا خروج مصر سے جس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں ہے جس کا نام خروج ہے۔ قرآن کریم نے وہی لفظ خَرَجُوْا اختیار کر کے اس مشہور واقعہ کا صاف پتہ بتا دیا ہے۔ دوسری تعیین اس کی لفظ اُلُوْفٌ سے ہوتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے سوائے جن کی تعداد بائبل میں چھ لاکھ لکھی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں اور کسی قوم کا خروج ثابت نہیں۔ اُلُوْفٌ کے دوسرے معنی جماعت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بنی اسرائیل پر ہی صادق آتا ہے کیونکہ کتاب خروج میں ان کو بار بار جماعت کے نام سے پکارا گیا ہے اور یہ امر کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دو آیتیں چھوڑ کر جو اس مضمون کے متعلق ہیں پھر صاف الفاظ میں ''موسیٰ کے بعد'' کے بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے۔ یہ تیسرا قرینہ ہے اور چوتھا یہ کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکل کر جنگ کرنے سے انکار کیا اور چالیس سال جنگل میں بھٹکتے رہے جو قومی موت تھی۔ پس یہ جہاد کا انکار تھا اور یہی مضمون رکوع کا ہے۔

بنی اسرائیل کی موت اور زندگی: آیت کے دوسرے الفاظ بھی اس مفہوم کے خلاف نہیں بلکہ موافق ہیں۔ مصر کو جہاں سے بنی اسرائیل نکلے تھے۔ دِيَارِهِمْ کہا اس لیے کہ چار سو سال سے وہاں ان کی بود و باش تھی بلکہ وہ تو ان کے لیے بمنزلہ وطن ہی تھا۔ اُلُوْفٌ کی تشریح ہو چکی ہے ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ موت کے خوف سے نکلے وہ موت فرعون کی غلامی تھی جو ان کو کمزور کر کے ادنیٰ اور بیگار کا کام لے کر ان کو ذلت کی موت مارنا چاہتا تھا: ﴿جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۳﴾ جاننے والا ہے۔(313)

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

کون ہے جو اللہ کے لیے اچھا مال الگ کرے تو وہ اسے اس کے لیے کئی گنا بڑھاتا ہے اور اللہ گھٹاتا اور بڑھاتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔(314)

نِسَآءَهُمْ﴾[القصص: 4:28] ''اس کے رہنے والوں کو فرقے بنا رکھا تھا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا اور ان کے بیٹوں کو مار دیتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔'' اور شروع سورۃ میں ﴿یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ آ ہی چکا ہے۔ پس یقیناً وہ موت کے خوف سے نکلے تھے۔ تو پھر ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا﴾ کس طرح ہوا؟ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے سے انکار کیا تو حکم ہوا: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾[المآئدۃ: 26:5] چالیس سال تک اس سرزمین وعدہ سے جو ان کی حیات قومی کا موجب ہونے والی تھی، محروم کر دیئے گئے، بیابان میں بھٹکتے رہے اور بائبل میں لکھا ہے کہ وہ نسل ہلاک ہوگئی۔[گنتی: 14:29-30]، اور اس کے ساتھ ہی ہے کہ تمہاری دوسری نسل یعنی تمہارے بچے اس زمین میں داخل ہوں گے۔ سو یہ ان کی موت تھی۔ ﴿ثُمَّ اَحْیَاهُمْ﴾ ''پھر ان کو زندہ کیا۔'' کیونکہ آخر کار وہ اس موعود سرزمین میں داخل ہوئے اور ایک بڑی قوم بنے۔ فاتح اور حکمران ہوئے، اعلیٰ اخلاق سے متصف ہوئے۔ یہی قوم کی موت اور زندگی ہوتی ہے۔

313- **تاریخ اسرائیل سے مسلمانوں کے لیے سبق:** بنی اسرائیل کے واقعات کے اندر مسلمانوں کو یہ حکم دینا بتاتا ہے کہ یہ ذکر کہانیوں کے طور پر نہیں بلکہ بتایا کہ تم بھی اگر خدا کی راہ میں جنگ کرنے سے انکار کرو گے تو موت وارد ہوگی۔ سو مسلمان جب غافل ہو گئے تو دوسری قوموں نے انہیں دبانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ موجودہ موت ہے۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے قرآن کریم سے فائدہ اٹھایا اور جنگ کے موقعہ پر گو وہ بہت تھوڑے تھے اور دشمن بہت زبردست۔ عرض کیا کہ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح نہیں کہتے بلکہ آپ کے حکم کے ماتحت چلیں گے جہاں آپ لے جائیں۔

314- یُقْرِضُ۔ قَرْضًا۔ قَرْضٌ اصل میں ایک قسم کا کاٹنا یا قطع کرنا ہے: ﴿تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾[الکھف: 17:18] ''تو ان کے بائیں طرف کترا جاتا ہے۔'' میں سورج کے غار کو سایہ میں چھوڑ کر آگے نکل جانے پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ قرض جس کو ہماری زبان میں ادھار کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں وہ مال جو انسان کو دیا جائے اس شرط پر کہ اس کا بدل لوٹایا جائے گا۔ (غ) اس لیے اس کا استعمال ہر اس فعل پر ہوتا ہے جس کا بدلہ دیا جائے۔ تاج العروس میں ہے کہ قرض جو اصل میں قطع کرنے کو کہتے ہیں اس سے حسب مراتب بہت سے معانی نکل آئے ہیں اور جوہری کا قول نقل کیا ہے کہ قرض وہ ہے نیکی سے ہو یا بدی سے جسے تم نے پہلے کیا ہے یعنی جس کا کوئی بدلہ ملنے والا ہے۔ اس پر امیۃ بن ابی الصلت کا شعر بطور شہادت پیش کیا ہے۔[كُلُّ امْرِئٍ سَوْفَ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ

کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں (کے حال) پر غور نہیں کیا؟ جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اس نے کہا کہ تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر جنگ کرنا تم پر ضروری ٹھہرایا گیا تو جنگ نہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا کیا عذر ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے جدا کیے گئے ہیں۔ پھر جب ان کے لیے لڑائی کرنا ضروری ٹھہرایا

يُجْزَى قَرْضَهُ حَسَنًا * أَوْ سَيِّئًا مُدِيْنَا مِثْلَ مَا دَانَا]۔ اور لکھا ہے کہ عرب کا محاورہ ہے وہ کہتے ہیں: [لَكَ عِنْدِيْ قَرْضٌ حَسَنٌ وَقَرْضٌ سَيِّءٌ] اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی اچھا یا برا فعل کیا ہے جس کا اچھا یا برا بدلہ تمہیں ملے گا۔ [وَأَصْلُ الْقَرْضَ مَا يُعْطِيْهِ الرَّجُلُ أَوْ يَفْعَلُ لِيُجَازٰي عَلَيْهِ] یعنی اصل قرض یہ ہے جو آدمی دے یا کرے تا کہ اسے اس پر بدلہ ملے۔ اور اس آیت میں لفظ قرض کے معنی ابو اسحاق سے نقل کیے ہیں کہ ہر وہ فعل ہے جس پر جزا چاہی جائے اور اخفش سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع اور اس کی فرمانبرداری میں نیک کام کرے۔ کیونکہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو عرب کے لوگ کہتے ہیں: [قَدْ أَحْسَنْتَ قَرْضِيْ] یا [قَدْ أَقْرَضْتَنِيْ قَرْضًا حَسَنًا]۔ اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ کا قرض مثال ہے ایسے عمل کے آگے بھیجنے سے جس پر ثواب کی امید ہو اور اسی میں ہے کہ قرض حسن مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

يُضَاعِفُ۔ اَضْعَافٌ۔ ضِعْفٌ کی جمع ہے اور کسی چیز کا ضِعْفٌ وہ ہے جو اسے دو چند کر دے اور ضَاعَفَ کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کی ایک مثل یا کئی مثلیں زیادہ کر دیں یا دو چند کیا یا کئی گنا کیا۔ (غ) اور ضعف اور ضُعف کے معنی کمزوری ہیں۔

يَقْبِضُ۔ قَبْضٌ کے اصل معنی ہیں پورے ہاتھ کے ساتھ کسی چیز کا لے لینا اور اس کا استعمال دونوں طرح پر ہے یعنی ایک چیز کو دوسرے سے لے کر اپنے پاس رکھنا یا ایک چیز دوسرے کو دینے سے ہاتھ روک لینا۔ امام راغب نے ﴿يَقْبِضُ وَ يَبْصُطُ﴾ کی کئی توجیہات کی ہیں۔ اللہ کبھی ایک چیز لے لیتا ہے کبھی دے دیتا ہے یا ایک قوم سے لے لیتا ہے اور ایک کو دے دیتا ہے۔ یا کبھی مارتا ہے، کبھی زندہ کرتا ہے اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کو اپنی طرف لے لیتا ہے پھر اس کو بڑھاتا ہے۔

يَبْصُطُ۔ اصل بَسْطٌ ہے جس کے معنی ایک چیز کا پھیلانا اور اس کو وسعت دینا ہیں۔

پہلی آیت میں جنگ کا حکم دیا اب انفاق فی سبیل اللہ کا، مجاہدات، نیک عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ جو اعمال للّٰہی ایثار

تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

گیا، ان میں سے تھوڑوں کے سوا (باقی) پھر گئے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے۔[315]

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي

اور ان کے نبی نے انہیں کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسے ہم پر بادشاہی کس طرح مل سکتی ہے اور ہم اس کی نسبت بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔ (نبی نے) کہا اللہ نے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور علم اور

کے رنگ میں کیے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ انہیں بہت بڑھاتا ہے۔ ﴿اِضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ کا بڑھانا گویا بے حد وحساب اجر دینا ہے۔ اسلام کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔ مفصل ذکر انفاق کا آگے آتا ہے۔ آخر پر ﴿اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ اس لیے فرمایا کہ مال کمانے کو زندگی کی غرض نہ سمجھ لینا۔

315- اَلْمَلَأ۔ مَلَأ کے اصل معنی بھرنا ہیں۔ ﴿مِلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا﴾ [آل عمران: 91:3] ''زمین بھر کر سونا'' اور مَلَأٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جو ایک رائے پر جمع ہوں۔ پس آنکھوں کو تازگی اور نظارے سے بھر دیں اور نفسوں کو خوبصورتی اور جلال سے۔ (غ)

اَبْعَثْ۔ بَعْثٌ کے اصل معنی کسی چیز کا اٹھانا اور سامنے لانا ہیں۔ مردوں کے اٹھنے، نیند سے اٹھنے، نبیوں کے بھیجا جانے، کسی کے کسی کام پر مقرر کیا جانے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (غ)

مَلِكًا۔ مَلِك وہ ہے جو لوگوں کے معاملہ میں امر ونہی پر متصرف ہو اور یہ انسانوں کی سیاست سے مخصوص ہے [مَلِكِ النَّاسِ] کہا جاتا ہے [مَلِكِ الْأَشْيَاءِ] نہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہ کا تصرف لوگوں پر ایک محدود تصرف ہے۔ مالک کی طرح نہیں جس کا تصرف تام ہے۔ [دیکھو نمبر: 3]۔

عَسَيْتُمْ۔ عَسٰی خواہش اور امید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے طمع اور ترجی کے لیے۔ (غ) اور یہ افعال مقاربہ میں سے ہے۔ امر محبوب میں امید دلانے کے لیے اور امر مکروہ میں ڈرانے کے لیے آتا ہے۔ (ت)

سیموئیل کا ذکر اور مسلمانوں کو نصیحت:

یہاں سے بنی اسرائیل کی ایک مثال شروع کی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر پر ختم ہوتی ہے۔ یہ نبی جس کی طرف یہاں اشارہ ہے سیمویل تھے دیکھو [اسیموئیل: 8:18, 19]۔ اس وقت بنی اسرائیل فلستیوں سے مغلوب ہو چکے تھے اور کئی دفعہ شکستیں کھا کر

الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

جسم میں اس کو بہت بڑھایا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک دیتا ہے اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہے۔(316)

ان کے ہزارہا آدمی کٹ چکے تھے ﴿قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا﴾[البقرة: 246:2] ''حالانکہ ہم اپنے گھروں سے جدا کیے گئے ہیں۔'' سے مغلوب ہوکر ملک دے بیٹھنا اور [مِنْ أَبْنَاءِنَا] سے آدمیوں کا کٹ جانا یا غلامی میں لیا جانا مراد ہے۔ یہ تاریخی مثال اس رکوع کے باقی حصہ میں اور کچھ اگلے رکوع میں مذکور ہے۔ غرض مسلمانوں کو سمجھانا تھا جو اپنے گھروں سے نکل چکے اور اپنے عزیز و اقارب سے الگ ہو چکے تھے کہ اب سوائے جنگ کے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ بھی سمجھایا کہ دشمن کی کثرت سے مرعوب نہ ہونا۔

316- بَسْطَةٌ کے معنی سَعَةٌ یا فراخی ہیں۔ بخاری میں بَسْطَةٌ کے معنی زِيَادَةً وَفَضْلًا دیئے ہیں۔

طَالُوْتَ۔ بائبل میں اس بادشاہ کا نام ساؤل لکھا ہے۔ قرآن شریف نے طالوت استعمال کیا ہے جو طول سے مشتق ہونے کی وجہ سے قد کی لمبائی پر دلالت کرتا ہے اور ساؤل قد میں بھی سب سے لمبا تھا۔[اسیموئیل: 23:10] ساؤل پر اعتراضات کا ہونا بھی بائبل سے معلوم ہوتا ہے۔[اسیموئیل: 21:9] اور[27:10]۔

بادشاہ کے انتخاب کے اصول:

لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ یہ بادشاہ اس لیے نہیں ہوسکتا کہ اس کا کوئی خاص حق بادشاہت کے لیے نہیں۔ یعنی بادشاہت کے خاندان سے نہیں اور نہ مال و دولت اس کے پاس زیادہ ہے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ﴾[البقرة: 247:2] یعنی اللہ نے نیکی کی وجہ سے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور دوسرے اس کو علم زیادہ دیا ہے۔ تیسرے اس کو جسمانی قوت میں فضیلت ہے۔

بادشاہت وراثت سے نہیں: اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہت کے انتخاب میں قرآن کریم ان اصول کو مدنظر رکھنے کی تعلیم دیتا ہے اور وراثت کی بادشاہت یا دولت مند ہونے کے لحاظ سے بادشاہت کا انتخاب اس کے نزدیک ٹھیک نہیں۔ مسلمانوں نے بالکل خلاف تعلیم قرآن اور نمونہ خلفائے راشدین بادشاہت کو وراثت قرار دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ بجائے قوت کا موجب ہونے کے کمزوری کا موجب ہو گئے۔ کیونکہ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ بادشاہ بنانے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ قوم کو دشمن کے مقابل میں قوی بنائے۔ لیکن بادشاہت جب بطور وراثت آجاتی ہے تو عیش پسندی کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور اصل غرض مفقود ہو جاتی ہے۔ پس بادشاہت یا امارت انتخاب سے ہے وراثت سے نہیں۔ اور انتخاب کے اصول یہ ہیں کہ جو شخص نیکی میں بڑھ کر اور علم میں زیادہ اور طاقتور ہو اسے بادشاہ بنایا جائے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نظم و نسق ملکی کے لیے بادشاہت کی ضرورت بھی ہے یعنی ایک ایسے شخص کی جو نظام حکومت کو قائم رکھنے والا ہو۔ نبوت اور بادشاہت چونکہ عموماً دو الگ الگ منصب رہے ہیں اس لیے باوجود نبی کی موجودگی کے بادشاہ کی ضرورت پڑی۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اوران کے نبی نے انہیں کہا کہ اس کی بادشاہی کا نشان یہ ہے کہ تمہارے پاس تابوت آئے جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکون اور اس کا بقیہ ہے جو موسیٰ کے سچے تابعداروں اور ہارون کے سچے تابعداروں نے چھوڑا ہے۔ فرشتے اسے اٹھائے ہوں گے(317) یقیناً اس میں

317- اَلتَّابُوْتُ۔ تَابُوْتٌ کے ایک معنی صندوق مشہور ہیں اور اسے تَوْبٌ سے مشتق کہا گیا ہے کیونکہ چیزیں اس میں لوٹ لوٹ کر آتی ہیں۔ مگر دوسرا قول یہ ہے کہ تابوت کے معنی پسلیاں اور جو کچھ ان کے اندر آ گیا، جیسے دل وغیرہ ہیں، اور صندوق پر بھی اس کا اطلاق ہو گیا ہے۔ (ت) لسان العرب میں بھی تابوت کے معنی قلب یعنی دل دیئے ہیں اور مثل نقل کی ہے: [مَا أَوْدَعْتُ تَابُوْتِيْ شَيْئًا فَقَدْتُهُ] میں نے اپنے تابوت یعنی دل کے سپرد کبھی کوئی شے نہیں کی جسے گم کر دیا ہو اور مفردات میں بھی یہ قول منقول ہے کہ تابوت سے مراد قلب اور سکینت ہے اور جو علم اس میں ہے اور لکھا ہے کہ قلب کو [سَفَطُ الْعِلْمِ] کہا گیا ہے یعنی علم کا ڈبہ اور اسے حکمت کا گھر اور اس کا برتن اور اس کا صندوق کہا گیا ہے اور قلب کا نام تابوت رکھا جانے کی وجہ سے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا کہ وہ ایک برتن ہے جو علم سے بھرا ہوا ہے۔ تفسیروں میں بھی تابوت کے معنی قلب منقول ہیں۔ بیضاوی میں ہے کہ ایک قول ہے کہ تابوت کے معنی قلب ہیں اور سَكِيْنَةٌ وہ علم ہے جو اس میں ہے اور ایسے تابوت یا دل کے آنے سے منشا یہ ہے کہ اس کا قلب علم اور وقار کی جگہ ہو جائے گا حالانکہ پہلے ایسا نہ تھا۔

سَكِيْنَةٌ۔ سَكَنَ سے ہے اور حرکت کے بعد کسی چیز کے ٹھہر جانے کو سکون کہتے ہیں۔ پس سَكِيْنَةٌ اطمینان قلب ہے یا مرعوب نہ ہونا اور یہ جو بعض مفسرین نے یوں ہی لکھ دیا ہے کہ وہ ایک شے ہے جس کا سر بلی کے سر کی طرح ہے۔ امام راغب کہتے ہیں یہ صحیح نہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ سکینت اس حالت کا نام ہے جب انسان کا میلان شہوات کی طرف سے رک جائے۔

بَقِيَّةٌ۔ بَقَاءٌ کسی چیز کی پہلی حالت پر رہنا ہے اور باقیات سے مراد وہ عمل ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہ جاتا ہے اور بَقِيَّةٌ اور باقیات کے معنی [كُلُّ عِبَادَةٍ يُقْصَدُ بِهَا وَجْهُ اللهِ] بھی دیئے ہیں۔ (غ) یعنی ہر ایک عبادت جس کے ساتھ اللہ کی رضا چاہی جائے اور بَقِيَّةٌ کے معنی تاج العروس میں [اَلْحَالَةُ الْبَاقِيَةُ مِنَ الْخَيْرِ] بھی دیئے ہیں یعنی خیر کی حالت جو باقی رہنے والی ہو۔

موسیٰ اور ہارون دونوں صاحب امت اور صاحب کتاب ہیں:

﴿اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ﴾ [248] اٰل کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 72]۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کی علیحدہ علیحدہ آل کا ذکر بتاتا ہے کہ قرآن شریف دونوں کو صاحب امت نبی قرار دیتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

ع 32 6 16 لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ تمہارے لیےنشان ہے اگر تم مومن ہو۔ (317)

خاص برکات سے حصہ لیتے ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت ہارون علیہ السلام کی برکات سے حصہ لیتے ہیں اور دوسری جگہ دونوں کو صاحب کتاب نبی بھی قرار دیا ہے: ﴿وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۝﴾ [الصّٰفّٰت: 117:37] ''اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی۔''

317- **بائبل کا تابوت اور توریت اور انجیل کا باہم اختلاف:** تابوت جس کے یہاں بطور نشان آنے کا ذکر ہے وہ کیا تھا؟ ایک مشہور تابوت وہ ہے جس کا ذکر بائبل کے دونوں مجموعوں یعنی پرانے اور نئے عہد ناموں میں پایا جاتا ہے۔ جو لمبائی میں اڑھائی ہاتھ اور چوڑائی اور اونچائی میں ڈیڑھ ڈیڑھ ہاتھ تھا اور اوپر سے خالص سونے میں منڈھا ہوا تھا اور اس کے اوپر سونے کا کلس تھا۔ [خروج: 10:25] اور [1:37] اور اس صندوق میں اسلاطین [9:8] کے مطابق ''سوا پتھر کے ان دو لوحوں کے جنہیں موسیٰ نے حورب پر اس میں رکھا تھا۔'' اور کچھ نہ تھا۔ مگر عبرانیوں [4:9] کے مطابق ''اس میں سونے کا برتن من سے بھرا ہوا اور ہارون کا عصا جس میں شاخیں پھوٹی تھیں اور عہد نامہ کی تختیاں اور اس پر جلالی کروبی تھے۔'' (اب یہ فیصلہ عیسائی کریں کہ ان دونوں الہامی کتابوں میں سے کون سی غلط ہے؟) یہ تابوت یا صندوق ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے قبضہ سے نکل کر فلستیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور کچھ مدت کے بعد انہوں نے اسے واپس کر دیا اور آخر کار حضرت داؤد علیہ السلام اسے یروشلم میں لے آئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس میں رکھا گیا اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلتا۔

قرآن میں کس تابوت کا ذکر ہے؟ اور عیسائیوں کا اعتراض:

بعض مفسرین نے یہی مذکورہ بالا تابوت مراد سمجھا ہے۔ بعض کہتے ہیں کوئی اور تابوت تھا جو حضرت آدم پر اترا۔ بعض کہتے ہیں وہ تابوت ہے جس میں حضرت موسیٰ کی والدہ نے حضرت موسیٰ کو رکھ کر دریا میں ڈال دیا تھا۔ ان میں سے قول اول کو لے کر عیسائیوں نے بزعم خود قرآن شریف کی بڑی بھاری تاریخی غلط بیانی ثابت کی ہے۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا ہے کہ یہ تابوت بروئے تاریخ مذکورہ بائبل طالوت سے بہت پیشتر واپس آچکا تھا۔ پس قرآن الہامی نہ ہوا۔ حالانکہ اسی تابوت کے قصہ میں پرانے اور نئے عہد نامہ میں اتنا بڑا اختلاف موجود ہے اور وہ دونوں الہامی مانے جاتے ہیں اور کبھی کوئی ایماندار عیسائی سوال نہیں کرتا کہ ان میں سے کس کو جھوٹا کہا جائے۔ بہرحال اگر التَّابُوْتُ سے مراد یہی تابوت لیا جائے تو بائبل میں جہاں فلستیوں کے اس تابوت کو لے جانے اور پھر واپس کرنے کا ذکر ہے وہاں سے ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ پادری ڈملو کی تفسیر بائبل میں اس کا صاف اعتراف موجود ہے۔ اول تو اسموئیل کی دونوں کتابوں کے متعلق یہ مسلم ہے کہ یہ خود کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کا ماخذ کوئی اور ابتدائی تحریر ہے۔ دوسرے تابوت کا ذکر اسموئیل کے پانچویں چھٹے باب میں ایسے بے ربط طریق پر ہے کہ پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''کہ تابوت کا ذکر جو پانچویں اور چھٹے باب میں ہے اس سے اس بات کا پتہ نہیں ملتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے؟

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا

پھر جب طالوت فوجوں کے ساتھ روانہ ہوا اس نے کہا کہ اللہ نہر کے ذریعے تمہارا امتحان کرنے والا ہے۔ پس جو اس میں سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو اسے نہ چکھے وہ مجھ سے ہے، مگر وہ جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ پھر ان میں سے تھوڑوں کے سوائے (باقیوں نے) اس

سوائے اس کے کہ یہ جنگ افیک کے بعد کا ہے۔'' چھٹے باب کی پہلی آیت میں لکھا ہے: ''صندوق سات مہینے تک فلستیوں کے ملک میں رہا۔'' اور ساتویں باب کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابوت بیس برس تک قریت یعاریم کے لوگوں کے پاس رہا ''اور سارے بنی اسرائیل نے خداوند کے لیے نالے کیے۔'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ مغلوب تھے۔ حالانکہ تابوت کا ان کے درمیان آنا بطور نشان تھا کہ وہ مظفر و منصور ہوں گے۔ پس یہ واقعات ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ اگر قرآن کریم میں اسی تابوت کا ذکر سمجھا جائے تو چونکہ اس کی واپسی بنی اسرائیل کی فتح و ظفر کی نشانی تھی اور فلستیوں پر ان کا فتح یاب ہونا ساؤل یعنی طالوت کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے اس بنا پر قرآن شریف کا بیان ہی صحیح قرار پاتا ہے۔

لیکن لغت اس بات پر شاہد ہے کہ تابوت کے معنی قلب یعنی دل ہیں۔ اور مفسرین نے ان معنوں کو لیا ہے۔ پس قرآن کریم کے الفاظ کا منشا صرف طالوت کے قلب کی طرف اشارہ کرنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس پر معترض تھے ان کو بتایا گیا کہ اس کا قلب وہ پہلا سا نہیں۔ خدا نے اس میں سکینت وغیرہ عطا کر دی ہے گویا اسے ایک دوسرا دل دے دیا ہے۔ خود اسموئیل [9:10] میں ہے: ''اور ایسا ہوا کہ جونہی اس نے سموئیل سے رخصت ہو کر پیٹھ پھیری وہیں خدا نے اسے دوسری طرح کا دل دیا۔'' خود الفاظ قرآنی اسی معنی کے مؤید ہیں۔ یہ تابوت وہ نہیں جس میں الواح ہوں یا من کا طشت ہو بلکہ وہ ہے جس میں سکینت تھی اور سکینت قلب پر ہی نازل ہوا کرتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الفتح: 4:48] وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی اور اسی سکینت نے ہی دشمن کا رعب ان کے دلوں سے دور کر دیا۔ پھر فرمایا کہ اس میں وہ اچھی باتیں تھی جو آل موسیٰ یعنی موسیٰ کے برگزیدہ پیروؤں اور آل ہارون یعنی ہارون کے برگزیدہ پیروؤں نے چھوڑیں۔ موسیٰ علیہ السلام قوم کے سردار تھے اور ان کے متبعین کامل اسی سرداری کے حقدار۔ ہارون علیہ السلام عبادات وغیرہ کراتے تھے خدا نے طالوت کو دونوں اچھی باتوں کا وارث بنا دیا۔ پھر فرمایا: ﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ [البقرة: 248:2] اس تابوت کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ بائبل میں اس تابوت کے ذکر میں ہے کہ گائے رتھ میں جوڑ کر اس پر وہ صندوق واپس کیا گیا اور یہ سنت اللہ نہیں کہ فرشتے لکڑی کا صندوق اٹھائے پھرتے ہوں۔ ہاں قلب کے حامل ملائکہ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں

جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً

سے پیا۔[318] پس جب وہ اس سے گزر گیا اور وہ جو ایمان لائے اس کے ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے کی طاقت نہیں۔ جنہیں یقین تھا کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں وہ بولے

حدیث کا یہ ٹکڑا درج کیا گیا ہے:[نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، تَحْمِلُهَا الْمَلَائِكَةُ] (جلد13،صفحہ 211) یعنی ان پر سکینت نازل ہوئی جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔

318- جُنُوْدٌ۔ جُنْدٌ کی جمع ہے،لشکر کو کہتے ہیں اور ہر ایک جماعت کو بھی۔﴿جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ﴾،﴿جُنُوْدُ رَبِّكَ﴾اور یہ جُنْدٌ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں سخت زمین جس میں پتھر ہوں۔

نَهَرٌ۔ نَهْرٌ اور نَهْرٌ پانی پینے کی جگہ اور نَهْرٌ کے معنی فراخی یا وسعت بھی ہیں۔(غ)﴿فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ﴾[القمر: 54:54] ''باغوں اور فراخی میں ہوں گے۔'' کی تفسیر میں ہے کہ اس سے مراد فراخی اور روشنی بھی لی جاسکتی ہے۔(ل)اور نَهَارٌ یا دن وہ ہے جس میں روشنی پھیل جاتی ہے۔(غ)

مِنِّيْ سے مراد ہے وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے۔حدیث میں ہے:[لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا] (جامع الترمذي، : 1919) ''جو چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔''

يَطْعَمْهُ۔ طَعْمٌ کا لفظ چکھنے پر بولا جاتا ہے۔خواہ کھانے کی چیز ہو یا پینے کی۔

اِغْتَرَفَ۔ غُرْفَةَ۔ غُرْفٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا اٹھانا اور لے لینا اور غُرْفَةٌ وہ ہے جو اس طرح لیا جائے یعنی چلو بھر۔اور غُرْفَةٌ کے معنی عَلِيَّةٌ یعنی چوبارہ یا بلند عمارت بھی ہیں۔(غ)﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ﴾[الفرقان: 75:25] ''انہیں بلند مقام بدلہ میں دیا جائے گا۔''﴿لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا﴾[العنكبوت: 58:29] ''ہم ضرور انہیں جنت کے بلند مقامات میں جگہ دیں گے۔''﴿وَ هُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ﴾[السبأ: 37:34] ''اور وہ بلند مقامات میں امن میں ہوں گے۔'' جو دونوں غُرْفَةٌ کی جمع ہیں۔

نہر سے آزمائش:

یہ آزمائش ہوسکتا ہے محض اس لیے کی گئی ہو کہ کون شخص بھوک اور پیاس کی شدت پر صبر کرسکتا ہے۔اگر مراد اس سے پانی کی نہر لی جائے اور اس طرح پر بہادروں اور دل کے کمزوروں کو الگ الگ کرنا ہو اور ہوسکتا ہے کہ نہر سے مراد وسعت اور فراخی ہو۔کیونکہ یہاں طالوت کی اس فوج کشی کا ذکر ہے جب جالوت کے مقابلہ میں وہ نکلا اور اس سے پہلے ان کو عمالیقوں پر فتح حاصل ہو چکی تھی اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا جس کا ذکر اسموئیل کے [باب: 15] میں ہے اور حالانکہ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ مال غنیمت کو حرام

كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

بسا اوقات چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آ گیا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (319)

کریں (یعنی تباہ کر دیں اور اپنے استعمال میں نہ لائیں) مگر طالوت کی فوجوں نے اس وقت عمدہ عمدہ مال غنیمت کو لے لیا اور اپنے تصرف میں لائے اور اس کے بعد یہ لوگ پھر فلستیوں کے مقابلہ میں بہت کمزور ہو گئے۔

جدعون کے ذریعہ سے پہلی آزمائش:

لیکن اگر نَہَرٍ سے مراد پانی کی نہر بھی ہو تو بھی عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ اس واقعہ کے یہاں لکھنے میں قرآن کریم نے تاریخی غلطی کی ہے صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ بروئے بائبل طالوت کے زمانے سے کوئی ڈیڑھ سو سال پیشتر جدعون کو پانی کے ذریعہ سے لشکر کو آزمانے کا حکم ہوا تھا۔ جس کا ذکر قاضیون کی کتاب کے ساتویں باب کے شروع میں ہے ''سو تو انہیں پانی پاس نیچے لا کہ وہاں میں تیری خاطر انہیں آزماؤں گا۔۔۔ اور خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ جو شخص پانی چپڑ چپڑ کے کتے کی مانند پیوے تو ہر ایک ایسے کو علیحدہ رکھ اور ویسے ہر ایک کو بھی جو اپنے گھٹنوں پر جھک کے پیوے۔'' اب قاضیون کی کتاب جس میں یہ واقعہ درج ہے اس کے متعلق بھی یہ امر مسلم ہے کہ یہ اصلی نہیں بلکہ پرانے مسودات کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس کے بیان واقعہ پر اس قدر وثوق نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تاریخی صحت پر شبہ نہ ہو سکے۔ خود اسی واقعہ میں کئی ایک غلط بیانیاں ہیں۔ پادری ڈملو اپنی تفسیر بائبل میں اعتراف کرتے ہیں کہ ''جن مقامات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ مشتبہ ہیں'' اور کوہ جلعاد کے ذکر پر لکھتے ہیں ''جلعاد یرون کے مشرق کو ہے یہاں مراد کوئی اور مقام ہونا چاہیے۔'' پس جب یہ واقعات اس قدر مشتبہ ہیں تو ان کی بنا پر قرآن کریم کے بیان کی تردید کس طرح ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں خود بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پکے اور کچے لوگوں میں امتیاز کے لیے اور بھی امتحان ہوئے اور ایک کا ذکر [استثناء: 8:20] میں ہے۔ اس لیے اگر جدعون کے وقت بھی ایسا واقعہ ہوا ہو اور طالوت کے وقت بھی تو کون سا امر بعید ہے۔ ایک کا ذکر بائبل نے کر دیا ایک کا قرآن شریف نے۔ یہ تو شاید کسی عیسائی کو دعویٰ نہیں کہ بنی اسرائیل کی ایسی مکمل تاریخ بائبل میں ہے کہ جس واقعہ کا وہاں ذکر نہ ہو وہ تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ بائبل میں یہ ذکر ہے کہ کتے کی طرح چپڑ چپڑ کے پانی پیئے۔ قرآن شریف میں ہے کہ ایک چلو بھر پانی پیئے پیٹ بھر کر نہ پیئے۔ یہ کلام زیادہ پر حکمت ہے۔

319- جَالُوْتُ۔ جَالَ سے ہے اور جَالَ فِي الْحَرْبِ کے معنی ہیں جنگ میں شدت سے حملہ کیا۔ بائبل میں اس کا نام جاتی جولیت دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اس قدر شدت سے حملہ آور ہوتا تھا کہ باوجود اس کے بار بار للکارنے کے بنی اسرائیل میں سے کوئی اس کے سامنے نہ نکلتا تھا۔

فِئَةٌ۔ فَيْءٌ سے ہے جس کے معنی ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا اور فِئَةٌ وہ گروہ ہے جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں اور ان کے بعض بعض کی مدد کے لیے لوٹ لوٹ کر آئیں۔ (غ)

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے نکلے انہوں نے کہا اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ اور کافر قوم پر ہمیں مدد دے۔ (320)

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ

پس اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو بھگا دیا اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت دی اور

چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر بسا اوقات دنیا میں غالب آتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ایک بڑے امتحان میں سے ہو نکلے اور حکم کے ماتحت ہر دکھ اور تکلیف کے اٹھانے کے لیے عزم کر چکے تھے اس لیے اس بات کے اہل تھے کہ تھوڑے ہونے کے باوجود بھی بہتوں پر غالب آئیں۔ اصل غرض مسلمانوں کو تشفی دینا تھا اور ہے بشرطیکہ وہ صابر بنیں۔ پھر جس صفائی سے تھوڑوں کے بہتوں پر غالب آنے کا نقشہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں نظر آتا ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمیشہ دشمن کی کثرت رہی اور مسلمان تھوڑے رہے۔ ہمیشہ سامان زیادہ دشمن کے پاس رہا مگر مسلمانوں میں قوت ایمانی صبر، برداشت کی طاقت ان کو نصرت الٰہی کا حقدار ٹھہراتی رہی۔ آج مسلمانوں کی مغلوبیت قوت ایمانی اور صبر ہی کی کمی کا نتیجہ ہے۔

320- بَرَزُوْا۔ بَرَازٌ کھلے میدان کو کہتے ہیں اور بَرَزَ کے معنی ہیں کھلے میدان میں آ گیا۔ بعض وقت کسی شخص کی جو حالت پہلے چھپی ہوئی ہو اس کے ظاہر ہو جانے پر بھی بَرَزَ بولا جاتا ہے جیسے: ﴿وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [ابراهيم: 48:14] ''اور (لوگ) اللہ اکیلے سب پر غالب کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔'' ﴿وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ [ابراهيم: 21:14] ''اور سب اللہ کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔'' ﴿يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ﴾ [المؤمن: 16:40] ''جس دن وہ نکل کھڑے ہوں گے۔'' (غ)

اَفْرَغَ۔ فِرَاغٌ خلاف شغل ہے اور اَفْرَغْتُ الدَّلْوِ کے معنی ہیں جو پانی اس میں تھا بہا دیا اسی سے افراغ کے معنی بہا دینا لیے گئے ہیں۔ (غ) اور فرغ کے معنی فراخی اور بہانے کے بھی آتے ہیں۔ (ل) یہاں افراغ صبر سے مراد صبر کا بہتات کے ساتھ عطا فرمانا ہے اور صبر سے مراد یہاں استقلال ہے۔

ثَبِّتْ۔ ثُبَاتٌ اصل میں خلاف زوال ہے اور بعض وقت ثبوت یا اثبات دلائل سے ہوتا ہے اور تثبیت کے معنی قوت دینا ہیں یعنی قوی یا مضبوط کرنا۔ (غ)

یہاں سے معلوم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ میں غلبہ، صبر اور ثابت قدمی سے ملتا ہے۔ اس لیے یہ دعا سکھائی جو لوگ ذرا ذرا مقابلہ پر ہمت ہار دیتے ہیں اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں وہ غالب نہیں ہو سکتے۔ جنگ میں بالخصوص صبر ہی سب سے زیادہ کام دینے والی چیز ہے۔

عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

جو کچھ چاہا اسے سکھایا[321] اور اگر اللہ بعض لوگوں لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرے تو زمین تباہ ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔[322]

321- دَاوٗدُ۔ بنی اسرائیل میں ایک عظیم الشان نبی ہیں جو نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی رکھتے تھے ان کا زمانہ 1017 قبل مسیح ہے آپ کے والد کا نام یسی تھا جو بیت اللحم کا رہنے والا تھا۔

اَلْحِكْمَةُ۔ حِكْمَةٌ کے اصل معنی تو علم و عقل کے ساتھ حق کو پالینا ہیں۔ (غ) یا علم و عمل کے ساتھ۔ (ت) اور مختلف موقعوں پر مختلف معنی میں اس کا استعمال ہوا ہے۔ کبھی کتاب کے مقابلہ پر اس کا استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد کتاب کا فہم یا تفصیلات شریعت یا سنت ہیں۔ [دیکھو نمبر: 164] یہاں ملک یا بادشاہت کے مقابلہ پر مراد اس سے نبوت و رسالت ہے۔ کیونکہ اس کے معنی نبوت اور سالت بھی آئے ہیں۔ (ت) اور فی الحقیقت نبوت اور رسالت سے بھی انسان حق کو پاتا ہے اور اللہ کی طاعت' تفقہ فی الدین اور عمل فہم و خشیت۔ ورع امر اللہ میں تفکر اور اس کا اتباع ان سب معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور حلم کے معنی میں بھی آیا ہے اور قرآن شریف اور توریت اور انجیل پر بھی بولا گیا ہے۔ (ت) اور سدی سے بھی حِكْمَةٌ کے معنی نبوت مروی ہیں۔ (غ)

بائبل میں طالوت کے متعلق متضاد بیان:

بائبل میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ساؤل یعنی طالوت کے پاس جانے کے متعلق دو متضاد بیان ہیں دیکھو [اسموئیل: 18:16] سے [22] اور [26:17] و [55 تا 58]۔ پہلا بیان یہ ہے کہ ساؤل نے داؤد کو بلا کر بربط بجانے پر رکھا تھا اور دوسرا یہ کہ جالوت کے مقابلہ میں دیکھا تو اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے اور یہ امر بائبل کی رو سے مسلم ہے کہ داؤد نے ہی جالوت کو قتل کیا اور ملک اور حکمت دونوں داؤد کو دینے سے منشا یہ ہے کہ بادشاہت اور نبوت دونوں دیئے۔

322- دَفْعٌ۔ دَفَعَ کا صلہ جب الیٰ ہو تو اس کے معنی اِنَالَةٌ یعنی دوسرے کو کسی چیز کا پہنچا دینا ہوتے ہیں۔ جیسے: ﴿فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ﴾ [النسآء: 6:4] جہاں مراد ہے کہ ان کے مال ان کے حوالے کر دو اور جب صلہ عن ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں۔ جیسے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [الحج: 38:22] ''اللہ مومنوں سے (دشمنوں کو) ہٹاتا رہتا ہے۔'' (غ) یہاں دفع اپنے اصل معنی میں ہے اَلْاِزَالَةُ بِقُوَّةٍ۔ (ل) یعنی قوت سے دور کر دینا۔ جس سے مراد لوگوں کی شرارت کا دور کرنا ہے۔

یہاں مذہبی جنگ کی حکمت بیان فرمائی۔ جب شریر لوگ دنیا میں زور پکڑ جاتے ہیں اور حق اور انصاف کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو تباہ کر دیتا ہے اور ذو فضل کہہ کر بتا دیا کہ جنگ ایک وقت فضل ہوتا ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی جنگوں کی طرف

تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّؕ-وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ(۲۵۲)

یہ اللہ کی باتیں ہیں جن کو ہم حق کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں۔ اور یقیناً تو مرسلوں میں سے ہے۔[323]

اشارہ ہے اس اصول کی تعلیم کہ جنگ کبھی فضل ہوتی ہے پہلے قرآن شریف نے ہی دی۔

323- **عیسائیوں کے اعتراض اور قرآن کی حقانیت:** اس اور گزشتہ رکوع کی بیشتر باتوں پر عیسائیوں نے تاریخی طور پر غلط ہونے یا گڈمڈ ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ مگر کیسی حقانیت قرآن شریف کی نظر آتی ہے کہ جہاں اعتراض ہونا تھا وہیں خود ہی ان باتوں کا ذکر کر کے فرمادیا کہ یہ جو کچھ پڑھا گیا بالحق ہے یعنی یہ واقعات صحیح بھی ہیں اور ایک ضرورت حقہ کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور جس قدر ضرورت تھی اسی قدر بیان کیے گئے ہیں۔ ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو جنگ درپیش تھی وہ تھوڑے تھے۔ ان کو سمجھانا مقصود تھا کہ وہ بہتوں پر کس طرح غالب آئیں گے اور یہ بھی بتادیا کہ منافق یا کچے لوگ تم سے جنگوں میں الگ ہوجائیں، تو یہ تمہارے لیے کمزوری نہیں بلکہ قوت کا موجب ہوگا۔ اور پھر فرمایا کہ ان جنگوں کی ضرورت اب فساد کو دور کرنے کے لیے ہے۔ یقیناً تو مرسلوں میں سے ہے یعنی خود ان باتوں کو بیان نہیں کرتا بلکہ خدا کی بتائی ہوئی باتیں ہیں اور پھر پہلے بھی رسولوں کو جنگ کرنی پڑی تو اب اس رسول کی جنگوں پر کیا اعتراض ہے۔